محمود واجد

مدیر

جلد : ۱۳ شمارہ : ۴۹ جنوری تا مارچ ۲۰۰۸

کراچی

اسالیب

مدیر : محمود واجد

مشیر ادبی : سائرہ غلام نبی
مشیر انتظامی : ممتاز ہاشمی

آرٹ : عادل منصوری

رابطہ کے لیے

ہاشمی ٹریڈنگ، اقبال منزل ۳، کیمبل روڈ، نزد برنس روڈ، کراچی ۷۴۲۰۰

تیز تر رابطہ

دفتر : 2624010-2626516
رہائش : 4640468-4655711
موبائل : 0300-2244866

جلد : ۱۳ | شمارہ : ۴۹ | جنوری تا مارچ ۲۰۰۸
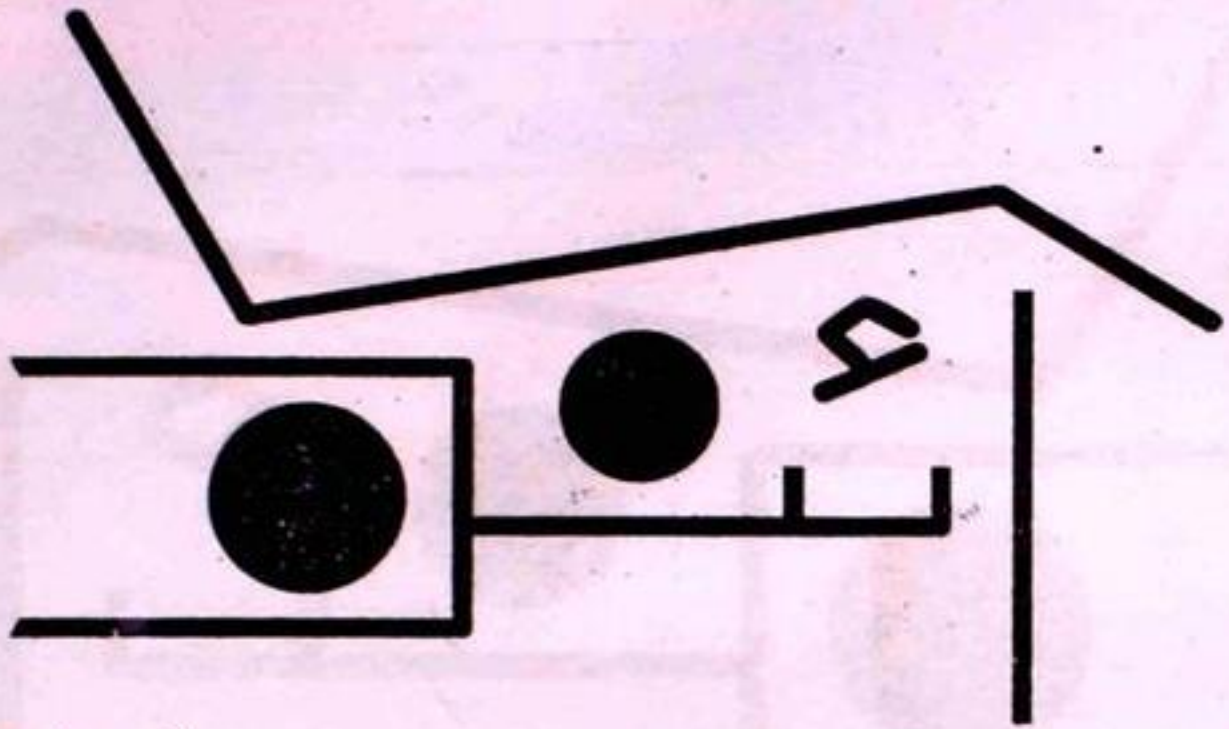
مدیر : محمود واجد

مشیر ادبی : سائرہ غلام نبی

مشیر انتظامی : ممتاز ہاشمی

کمپوزنگ : محمد علی عطاری 0300-2696830

ٹیرف (پاکستان)

عام شمارہ : ۸۰ روپے

صفحات : ۱۶۰

قیمت (سالانہ) : ۳۰۰ روپے

(مع ڈاک خرچ)

دیگر ممالک (سالانہ)

بھارت/بنگلہ دیش : ۴۰۰ روپے

سعودی عرب/امارات : ۱۲۰ ریال/درہم

یورپ/امریکہ : ۲۰ پاؤنڈ/۳۰ ڈالر

(مع ڈاک خرچ)

تہذیب

قطعات

دوہے

فِکشن

غزلیں

گیت ہی گیت

اور زبانوں کا ادب

مطالعے اور جائزے

محبتیں اور شکایتیں

عین سلام (کوئٹہ)، فتح محمد ملک (اسلام آباد)، افتخار عارف (اسلام آباد)، امجد اسلام امجد (لاہور)، رشید امجد (راولپنڈی)، طاہر نقوی (کراچی)، حسیر نوری (کراچی)، سیّد احمد رئیس (کراچی)، صوفیہ انجم تاج (امریکہ)، نجم الدین (بھاول نگر)، محمد مشتاق آثم (واہ کینٹ)، ریاض بلوچ (گوادر)، رب نواز مائل (کوئٹہ)، وحید الحسن (امریکہ)، فہیم جاوید (ریاض)، یوسف امام (شارجہ)، یعقوب تصور (ابوظہبی)، شہاب الدین ثاقب (علی گڑھ)، کرشن کمار طور (دھرم شالہ)، نجم عثمانی (دھنباد)، عذرا نقوی (ریاض)، بھگوان داس اعجاز (دہلی)، قیوم واثق (جدہ) عقیل گیاوی (دھنباد)، نذیر قیصر (پنجاب)، عبدالاحد ساز (بمبئی)۔

کھانسی، نزلہ، زکام
کسی موسم یا کسی وقت کے پابند نہیں

ہمدرد کی مجرّب دوائیں ان کا علاج بھی ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کی مؤثر تدبیر بھی

سُعالین

مُفید جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ سُعالین، گلے کی خراش اور کھانسی کا آسان اور مؤثر علاج۔ آپ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، سرد و خشک موسم یا گرد و غبار کے سبب گلے میں خراش محسوس ہو تو فوراً سُعالین لیجیے۔ سُعالین کا باقاعدہ استعمال گلے کی خراش اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔

جوشینا

نزلہ، زکام، فلو اور اُن کی وجہ سے ہونے والے بخار کا آزمودہ علاج۔
جوشینا کا روزانہ استعمال موسم کی تبدیلی اور فضائی آلودگی کے مُضر اثرات بھی دُور کرتا ہے۔
جوشینا بند ناک کو فوراً کھول دیتی ہے۔

لعوق سپستاں

نزلے زکام میں سینے پر بلغم جم جانے سے شدید کھانسی کی تکلیف طبیعت نڈھال کر دیتی ہے۔
اس صورت میں صدیوں سے آزمودہ ہمدرد کا لعوق سپستاں، خشک بلغم کے اخراج اور شدید کھانسی سے نجات کا مؤثر ذریعہ ہے۔
ہر موسم میں، ہر عمر کے لیے

صُدوری

مؤثر جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ خوش ذائقہ شربت۔ خشک اور بلغمی کھانسی کا بہترین علاج۔ صدوری سانس کی نالیوں سے بلغم خارج کر کے سینے کی جکڑن سے نجات دلاتی ہے اور پھیپھڑوں کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔ بچوں، بڑوں سب کے لیے یکساں مُفید۔
شوگر فری صُدوری بھی دستیاب ہے۔

سُعالین، جوشینا، لعوق سپستاں، صُدوری ۔ ہر گھر کے لیے بے حد ضروری

مدینۃ الحکمہ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ

ہمدرد کے متعلق مزید معلومات کے لیے ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے :
www.hamdard.com.pk

arts-SJLS-1/2001

Noorani

ادا ریہ:

کدھر جائیں گے اب؟

یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ اس طرح کے سوال اُسی وقت اُٹھائے جاتے ہیں جب ہم اپنے سفر کی بعض منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ ہم نے تو مرکزی طور پر ہونے اور نہ ہونے کے بنیادی سوال سے خود کو جوڑ رکھا ہے اگر ہیں تو کس طرح اور نہیں تو کیوں کر۔! بعض لوگ اپنے ہونے پر اصرار کرتے ہیں اور نہ ہونا ثابت ہو جائے تو روٹھ جاتے ہیں ان کو منانے والے بھی مل جاتے ہیں اور وہ شرما کر اسی کارزار میں پھر شامل ہو جاتے ہیں اس بات سے قطع نظر کہ ان کا ہونا ثابت ہو سکا یا نہیں۔ ایسی محبوب اداؤں سے ادب کا کچھ بھلا نہیں ہوتا۔

ادب اپنی نوع میں بڑے جان لیوا مقامات سے گزرنے کی کوشش کا نام ہے۔ اس میں نکتہ ارتکاز فن کی تفہیم کی منزلوں سے آگاہی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ باقی تو باتیں ہی باتیں ہیں اور تخلیق جسے ہم ایک لمحے کا عمل سمجھتے ہیں ترسیل کی محتاج ہی رہے گی اگر شعور فن کی منزلوں سے گریزاں ہو۔ فن کی اساس بہر حال زندگی ہے اور رہے گی خواہ اس کی کوئی بھی صورت لکھنے والے (تخلیق کار) کو قبول ہو۔ گویا ادب کو زندگی سے خارج نہیں کیا جا سکتا اور اس کی قدریں عمل کی بھٹی سے ہو کر گزرتی ہیں اور با معنی تخلیق تو بڑا جان لیوا عمل ہے۔ اظہار، ترسیل، ابلاغ کے مراحل تو بہر حال آئیں گے لیکن انجام کار تفہیم کے بغیر ادب کی تخلیق کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

تو آیئے ہم دیکھیں کہ ہم نے اب تک جو کچھ کیا ہے یا پیش کیا ہے اس کے معنی اور جواز بن سکے یا نہیں اگر ہاں تو عمل جاری رہنا چاہیے خواہ اس کی راہ میں کتنی ہی دشواریاں حائل ہوں۔ اس کا فیصلہ بہر حال آنے والے وقت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے کہ کون سا عمل صائب تھا اور ہمیں انسانی قدروں کے احساس کے ساتھ کسی راہِ عمل پر چلنے کی ترغیب کا باعث بنا جو نسلِ انسانی کو اپنی تفہیم کے ساتھ زندہ رہنے پر مائل کر سکا۔ گویا خود شناسی پر ہمارے اپنے کاموں کی بنیاد رکھنا ہمارا اصل نکتہ نفوذ (Thrust) بنایا نہیں اس پر ہمارے اگلے قدم کی کامیابی کا انحصار ہوگا۔ آیئے دیکھیں ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہم قاری کو ساتھ لے کر چلنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ کیا یہ روّیہ مناسب نہیں!

(محمود واجد)

۲۸ مارچ ۲۰۰۸ء

دوسرا صفحہ

آج کے Digitalised عہد میں اگرچہ یہ خدشہ اپنی جگہ کہ تحریر کیے جانے والے مواد میں معنی کس قدر کا حامل ہوگا۔اور الفاظ کے ذریعہ خیال کی ترسیل و تفہیم اخذ کرنے کے لیے قاری موجود ہوگا بھی یا نہیں؟

تقریباً ڈیڑھ دہائی سے کثیرالاشاعت میگزین سے وابستگی کے ساتھ ساتھ ادبی پرچے (آئندہ) سے انسلاک کے حوالے سے قاری کے ذہن کو پڑھنے کے لیے اس دوران بہت وافر مواقع ملے ہیں۔

الیکٹرانک ذرائع کے عام افراد کی زندگی میں بے پناہ عمل دخل سے قاری کا رویّہ بہت اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔اس کی نظر میں وسعت و کشادگی سے گہرائی بھی آئی ہے۔ یہاں تک کہ وہ فہم و شعور میں ادیب کے ساتھ ساتھ کھڑا ہے۔ایسے میں تخلیق اگر مختلف موضوع و معنوی دائروں کو سمیٹ سکنے سے قاصر ہے تو قاری محض آرائشگی یا مشاطگی سے بہلنے والا نہیں رہا ہے۔

وہ ادیب جو آج اس نئی اور بدلی ہوئی دنیا میں آنکھ کھولنے کی سکت نہیں رکھتے، اور اس کوند میں ان کے پلکیں جھک جاتی ہیں۔یا پھر ان کی نرگیست کی ماری آنکھ، کشادگی سے محروم صرف درون میں جھانکتی رہ جاتی ہے، ایسے میں وہ بوسیدہ فکری نظام سے جڑے رہ جاتے ہیں۔ایسے محدود نظریاتی فکر کی حامل تخلیقات کو آج کا قاری جرأت سے رد کرنے کی جسارت رکھتا ہے۔اور پھر ادیب گلہ مند ہوتا ہے کہ قاری ادب کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔

ادب کا ہمہ وقت تر و تازہ ہونا۔جدید فکری نظام سے آشنا ہونا اور تکرار کی بجائے ندرت کا حامل ہونا ہی قاری کی موجودگی کو یقینی بنا سکتا ہے۔یہ محض ہمارا مشاہدہ یا تجربہ ہی نہیں امر واقعہ بھی یہی ہے۔

سو آیئے ہم اسے قبول کریں کہ یہی صحیح راہِ عمل ہے!

(سائرہ غلام نبی)

جمیل عظیم آبادی

رموزِ فطرت

(حمدیہ نظم)

یہ مہرِ تاباں کی لن ترانی
کہ ماہ و انجم کی ضَوفشانی
نسیم صبح بہار رنگیں
صبا کے جھونکے سرور آگیں
یہ کوہ و دریا کہ دشت و صحرا
نگارِ فطرت کا شوخ چہرا
بتائے کوئی کہ کون ہے وہ
جو نظم عالم چلا رہا ہے
زمیں کی گردش فلک کی دوری
خلا نور دوں کی ناصوری
کبھی تصرف میں چاند تارے
کبھی خلاؤں میں بے سہارے
"رموزِ فطرت" کو ڈھونڈتے ہیں
کبھی تحیر سے پوچھتے ہیں
یہ راز کیا ہے یہ کون ہے وہ
جو نظم عالم چلا رہا ہے

اُسی نے جن و بشر بنائے
پھر اُن کو علم و ہنر سکھائے
اُسی نے انساں کو زندگی دی
اُسی نے ایماں کی روشنی دی
اُسی نے سب کو حیات بخشی
اُسی نے یہ کائنات بخشی
اُسی کے قبضے میں دونوں عالم
وہی چلاتا ہے کل جہاں کو
اُسی کی سب پر ہے حکمرانی
نہ کوئی ہم سَر، نہ کوئی ثانی
کمالِ یزداں کی ترجمانی
جمالِ یزداں کی ضَوفشانی
کبھی نمودِ سحر کی صورت
کبھی ضیائے قمر کی صورت
اجالے جس کے نگر نگر میں
وہ "کل" ہے، باقی حقیر تر ہیں

❁❁

Address:
B-452, Sector : 11-A
North Karachi - 75850
Ph # 6908083

خواجہ منظر حسن

اَفلاک نما

(نعتیہ نظم)

یہ نعت کی محفل جو سجی ہے نشر کا ہے
اب جبرئیل کے بنیں گے قدح صلِ علیٰ سے
کردار ولی ہے سخن بیش بہا ہے
کہسار کی رفعت کہ غارِ حرا ہے
وہ چارہ گر و راہبر ہر کس و ناکس
پیوند نمایاں تھے سر جامۂ اقدس
وہ لات کے پیرو ہوں کہ عُزّیٰ کے تعرب
ان کو بھی دعا دینے کو تھے مگر لب
بنتی ایک لڑی سی عربی ہوں عجمی ہوں
صدیقؓ ہوں، فاروقؓ ہوں، عثمانؓ، علیؓ ہوں
ہوتے نہ محمدؐ تو دو عالم بھی نہ ہوتے
افلاک بھی، جنت بھی، جہنم بھی نہ ہوتے
اللہ کا پیغام نبیؐ نے جو دیا ہے
وہ سب سے بڑا، سب سے بڑا، سب سے بڑا ہے
بیٹھے ہیں سر بزم جو توحید کے پیاسے
نعت نبی و منقبت و حمد و ثنا سے

گنتے ہیں گنہ بڑھتے ہیں، عقبیٰ لے اٹھائے
اللہ کے محبوب کے نقشِ کفِ پا سے
اک چاپ سی اُبھری تھی رہِ صدق و صفا سے
پھر سارا جہاں گونج اُٹھا حق کی صدا سے
تھی جس کی تسلی کے لیے نانِ جویں کو
کیا پیرہن ریشم و پشمینہ و اطلس
نازش زطعامے نہ تفاخر زلباسے
تھے در پئے آزاد نہیں خورد وکلاں سب
ہوتا ہے کہ پس جاتی ہے پتھر پہ حنا جب
پھر رنگ اُبھرتا ہے کہیں برگِ حنا سے
ایوبؓ ہوں، بوذرؓ ہوں، بلالؓ حبشی ہوں
ازواجِ مطہر ہوں کہ وہ آلِ نبیؐ ہوں
وہ فاطمۃؓ زہرا ہوں کہ حضرت کے نواسےؓ
آدم بھی نہ ہوتے، بنی آدم بھی نہ ہوتے
اللہ کے دربار میں سرخم بھی نہ ہوتے
تخلیق کا ادراک ہے افلاکِ نما
وہ منتظم کارگہ ارض و سما ہے
مسجود کہہ دو نہ کوئی اس کے سوا ہے
احساس اُبھرتا ہے یہ وردِ کلمہ سے
تابائی زلالِ ہے ضیا باری لا ہے

❁❁

Address:
A-3, Sector 11-B
North Karachi : 70850

سیّد ابوالخیر کشفی

تھوڑی سی روشنی

ہمارا آپ کا یہ دور تجارت کا دور ہے۔ بڑے پیانے پر ہر شے کی تجارت کا دور۔ اس تجارت میں ''اقدار'' بھی محفوظ نہیں اور ایسے ''لوگ'' بھی خال خال رہ گئے ہیں، جو شمع کی طرح دوسروں کی خاطر جیتے ہیں۔ اس اندھیرے میں جو تھوڑی بہت روشنی نظر آتی ہے وہ ایسے ہی نفوس کے دم سے ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس لیے اپنی جان سے گزر جاتے ہیں، کہ ہم اخلاقی طور پر اور انسانی سطح پر زندہ رہ سکیں ایسے لوگوں کو نظیریؔ اور اقبالؔ نے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

بملک جم ندہم مصرعۂ نظیریؔ را کسے کہ کشتہ نہ شود از قبیلۂ ما نیست

محبانِ ادب! مبارک باد کے مستحق ہیں کے انہوں نے ''قبیلۂ کشتگان'' کے ایک فرد کو تلاش کر ہی لیا اور ہم سب کو دعوت دی کہ اس کی تقریب پذیرائی میں شرکت کریں، یہ محبانِ ادب کی بھی سعادت ہے اور ہماری بھی، ہم سب یاجوج ماجوج کی طرح دیوارِ رزق کو چاٹ رہے ہیں اور بڑے شہر تو ویسے بھی اپنی تہذیبی قوت کھو بیٹھتے ہیں، ان حالات میں آج شام ہماری یکجائی اک ایسی بات ہے جس پر اللہ کا شکر بھی واجب ہے میں رفعت القاسمی کی شاعرانہ حیثیت پر کچھ نہیں کہنا چاہتا بلکہ ان کی ان صفات کی طرف کچھ اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو تقریباً چالیس سال کے عرصے میں مجھ پر آہستہ آہستہ منکشف ہوئی ہیں اور ان کے شعر بھی وہ روزن ہیں جن سے ان کی ذات میں جھانکا جاسکتا ہے۔

رفعت القاسمی کی ماں نے مرتے دم انہیں خاتونِ جنت حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سپرد کیا تھا میرا مشاہدہ ہے مرتے وقت نیک انسانوں کو لینے کے لیے ارواحِ مقدسہ تشریف لاتی ہیں وہ ارواح جن سے ان لوگوں کا گہرا تعلق ہو۔ خاتونِ جنت کے کتنے نمایاں خوبیوں میں ایک خوبی اکلِ حلال بھی ہے اور ہم آپ جانتے ہیں کہ ''جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری۔''

رفعت القاسمی نے ''بینکاری'' کو اپنایا اور اس حد تک طویل تجربہ کے بعد دو بینکوں کی بنیاد ڈالی اور اس طرح ایک اخباری ادارے کے مینجنگ ڈائرکٹر بنے مگر وہ ''نانِ شعیر'' جو انہیں ''ودیعت'' کی گئی تھی اس نے انہیں ان جنجالوں سے آزاد کردیا، اور وہ اس فقر کے وارث بنے جو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے عظیم المرتبت ''باباﷺ'' کی میراث ہے، میں نہیں جانتا کہ رفعت القاسمی کا انتخاب ہے، یا عطیۂ خداوندی معاشی فارغ البالی کے

رضی شہروں نے فرمانِ نیم شبی کی دولت پائی، اور انہوں نے اپنی کتنی ہی راتوں کو حالتِ سجدہ میں سحر تک پہنچایا۔

نئی صبح کی اذاں [illegible] یاں   [illegible] سر اٹھائے سجدے سے

یہ سجدے آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سامان بن جاتے ہیں۔

اس انداز زیست نے رفعت القاسمی کو وہ دل عطا کیا جو انسانوں کے دکھوں کا [illegible] بھی ہے اور ہر درد [illegible] سے بے نیاز قاسمی کا یہ شعر صرف ان کی ذات کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ قبیلۂ انسان کے افراد کی رو[illegible]:

تیرا کرم تو نے دیا دل دکھا ہوا   میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول

میں نے قاسمی جی [illegible] بہر حال [illegible] آدمی میں نفس [illegible] پایا ہے [illegible] قیمتی گاڑی سے چابی کا گچھا اچھالتے ہوئے اتر رہے ہوں یا کسی گرم دوپہر [illegible] سے پیدل چل کر آ رہے ہوں "زر و مال جہاں" کبھی قاسمی کا حوالہ نہیں رہا۔ ان کا حوالہ تو دل دردمند اور ان کی وہ [illegible]ت ہے کہ دوسروں کے [illegible] ان کی پلکوں پر چمکتے ہیں۔

رفعت القاسمی کا ذہنی رشتہ خسرو سے بھی ہے بیدل سے بھی غالب و اقبال سے بھی مگر اکثر وہ میر صاحب کی محفل ہی میں نظر آتے ہیں۔

میر کی تقلید ہی نہیں ہے بلکہ یہ انداز زیست اور انداز نظر مماثلت بھی ہے اور ادب کی دنیا میں تو مختلف ادوار کے لوگ ایک دوسرے کے ہم عصر بن جاتے ہیں اس اعتبار سے میر صاحب اور رفعت القاسمی ہم عصر ہیں جب ہم قاسمی صاحب کو کراچی کی محفلوں اور تفریح گاہوں میں تلاش کرتے تو ان لمحات میں وہ میر صاحب کی محفل میں براجمان ہوتے ہیں:

یہ مت کہیو فقط ہم پیروی میر کرتے ہیں   یہ سچ ہے اس کے ہی شعروں میں سے [illegible] اپنی

صحبت میر میں بھی رفعت القاسمی اپنے اوراد و اشغال سے غافل نہیں رہتے۔ اور وہ کیا ہیں ان ہی سے سنیے۔

رفعت ذکر مصطفیٰ کیجیے   پہلے کچھ حمد اور ثنا کیجیے

❁❁

Address:
OMER HOMES
Flat # 2, Plot # 11-C
Ittehad Lane 7
DHA, Phase VI
Karachi : 70550

رفعت القاسمی

غزل

جنوں کی دسترس میں کیا نہیں تھا
مگر جینے کا اندیشہ نہیں تھا

عجب قربت تھی اس کی بے رُخی میں
وہ اپنا تھا مگر اپنا نہیں تھا

یہ سچ ہے ٹوٹ کر چاہا تھا اس نے
تو کیا میں نے اسے چاہا نہیں تھا

مَیں تنہائی میں اکثر سوچتا ہوں
کہ وہ تو بے وفا ایسا نہیں تھا

یہ دل کس طرح اس کو بھول جاتا
یہ دل ایسا بھی دیوانہ نہیں تھا

بغیر اس کے بھی دن گزریں گے اپنے
یہ اک لمحے کو بھی سوچا نہیں تھا

وہ مجھ سے دور رہ کر خوش رہے گا
مجھے کچھ اس کا اندازہ نہیں تھا

وہ اپنے حسن میں یکتا تھا لیکن
طریقِ عشق میں یکتا نہیں تھا

کئی پہلو ہیں حسن و عاشقی کے
ارادہ حسن کا اچھا نہیں تھا

اسی کافر کی تھی ساری خدائی
مری مانند وہ تنہا نہیں تھا

بہت شفاف، آئینے کی صورت
وہ چہرہ عشق تھا سایہ نہیں تھا

یہ دنیا بٹ گئی ہے دائروں میں
کبھی دنیا کا یہ نقشہ نہیں تھا

حصارِ جسم و جاں میں بند تھا میں
رہائی کا کوئی رستہ نہیں تھا

پہاڑ آئے کئی راہِ خرد میں
جنوں منت کشِ تیشہ نہیں تھا

نوائے درد سے میں نے یہ جانا
کہ میرا دل تھا آئینہ نہیں تھا

دیئے ہیں تو نے دُکھ پیغمبری کے
الٰہی یہ مرا رُتبہ نہیں تھا

محبت گویا اک کارِ زیاں ہے
تمہیں کیا میں نے سمجھایا نہیں تھا

❁❁

Address:

حنیف فوق

سجاد ظہیر کی "لندن کی ایک رات" : بازدید

سجاد ظہیر کی "لندن کی ایک رات" کا آغاز عرضِ مصنف سے ہوتا ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ "پیرس میں بیٹھ کر چند مخصوص جذباتی کش مکش سے متاثر ہو کر سوڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندوستان میں ڈھائی سال مزدوروں کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں انسانوں کے ساتھ سانس لینا اور ان کے انقلاب کے دل کی دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔" یہاں ظاہر ہے کہ سجاد ظہیر نے اپنی ترجیحات کا تعین کیا ہے اور مزدوروں، کسانوں کی انقلابی تحریک کو زیادہ اہم قرار دیا ہے۔ پیرس کا حوالہ کئی لحاظ سے اہم ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ سجاد ظہیر کے لیے یہ نظریاتی حوالہ کئی مغالطوں کا باعث بھی بنا ہے۔

سجاد ظہیر ایسے کثیر الجہات صاحب قلم تھے کہ شاعری اور نثر نگاری دونوں ان پر آسان ہو گئی تھیں۔ "لندن کی ایک رات" ان کی تخلیقی جنبش قلم کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کا افسوس ہے کہ اس ناول کی بعض اہم خصوصیات کا اس طرح اعتراف نہیں کیا گیا جو اس کا جائز حق ہے۔ ناول نگاری کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی تو "لندن کی ایک رات" کے اعتراف کمال کے بغیر بات نامکمل رہے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ روشنی کی ایک لکیر بن کر چمکے اور ان کی فعال حیثیت نے دوسرے رخوں کو مدھم کر دیا۔

سجاد ظہیر نے معاشیات میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی لندن سے جرنلزم کا ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ سجاد ظہیر نے یورپ کے جدید فرانسیسی، انگریزی کالموں اور مفکروں کی کتابوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ وہ یوں بھی وسیع المطالعہ انسان تھے۔ خاص طور پر وہ اناطول فرانس اور برٹرنڈرسل سے متاثر ہوئے لیکن ان کے مطالعہ کی حد نہ تھی۔ ان کے ہم عصروں میں ملک راج آنند کا ناول "اچھوت" چھپ چکا تھا اور "قلی" چھپنے والا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا اس کی بڑی بنیاد نظریاتی ہم آہنگی تھی۔ وہ رائف فاکس، لوئی آراگون، آڈن، اسٹیفنز اسپنڈر سے متاثر ہوئے۔ خاص طور پر انہوں نے رائف فاکس کا ذکر تعریفی انداز میں کیا ہے۔ سجاد ظہیر کو اپنے دوست ہتھی سنگھ کے ذریعے کئی گجراتی، مرہٹی ادیبوں سے ملاقاتیں بھی میسر ہوئیں اور ادب سے بھی آشنا ہوئے۔ ترقی پسندی اپنے ساتھ تخلیقی سفر کرنے والوں کا ایک قافلہ لے کر آئی تھی۔ پریم چند نے اپنے خطبے میں کہا تھا: "ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت

ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں، کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔" سجاد ظہیر کو غیر معمولی بصیرت حاصل تھی۔ آکسفورڈ سے ان کا پرانا تعلق رہا۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے آکسفورڈ سے بی۔ اے۔ کیا۔ مختصر افسانوں کا انتخاب "انگارے" شائع کرایا۔ مگر وہ ضبط ہوگیا۔ اس میں احمد علی، رشید جہاں، سجاد ظہیر، محمود الظفر کی کہانیاں تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی (لندن) سے جرنلزم کا ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ انہوں نے یورپ کے جدید فرانسیسی، انگریزی عالموں اور مفکروں کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔

مارچ ۱۹۲۷ء میں سجاد ظہیر عرف بنے بھائی ولایت کے لیے روانہ ہوئے۔ مارسلز (فرانس) میں یورپ کی اوّلین جھلکیاں دیکھیں جن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

زیب النساء کا مقالہ جس پر انہیں الٰہ آباد یونیورسٹی کی جانب سے ڈی فل کی ڈگری تفویض کی گئی ایک اہم کام کی حیثیت رکھتا ہے۔ سید جعفر احمد کی کتاب "سجاد ظہیر شخصیت اور فن" کی حیثیت ایک تالیف کی سی ہے۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر پر "بنے بھائی" اور "سجاد ظہیر کی تخلیقی اور تنقیدی جہات" پر اپنی کتابیں شائع کرا چکے تھے۔ روس اور مشرق کے دیگر مسلم محنت کش افراد کے نام لینن نے جو اپیل شائع کی تھی۔ اس کے ممبر کی حیثیت سے ستار خیری اور جبار خیری روس جا کر لینن سے ملے اور تبادلۂ خیال کیا۔ لیکن ہندوستان میں برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد جو تاریخی فریضہ انجام دے رہی تھی، سجاد ظہیر اس کے ساتھ تھے۔ اسے تو وہ "لندن کی ایک رات" لکھتے وقت نہیں بھولتے۔ سجاد ظہیر ادیبوں کے اس روشن خیال سلسلے سے تعلق رکھتے تھے جو سر سیّد اور حالؔی کے نئے شعور سے متاثر ہوئے۔ برطانوی حکومت بقول مارکس "تاریخ کا غیر شعوری آلۂ کار" تھی۔ سجاد ظہیر وسیع المطالعہ ادیب تھے۔ رالف فاکس، مارکس اور دوسرے ترقی پسندانہ خیالات رکھنے والوں سے وہ متاثر ہوئے۔ آکسفورڈ ہی میں ان کی ملاقات محمود الظفر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر اشرف اور دوسرے ترقی پسندانہ خیالات کے حامل افراد سے ہوئی۔

جیمس جوائس کی کتاب ۱۹۲۲ء میں شائع ہو چکی تھی۔ لیکن صرف اس کا فرانسیسی ایڈیشن طبع ہوا تھا جس کے لیے اسے ایذرا پاؤنڈ (Ezra Pound) کی اعانت حاصل ہوئی۔ انگریزی میں اس ناول کے شائع نہ ہونے کی وضاحت جیمس جوائس نے اس کے ماڈرن لائبریری ایڈیشن میں کی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں اس کا انگریزی ایڈیشن بھی منظر عام پر آیا۔ جیمس جوائس کی تحریر سے ان کا لاکھ اختلاف سہی، لیکن ایک ایسی کتاب جو اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئی کیا سجاد ظہیر کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ راں بو، ملارمے اور بودلیئر کو ناپسند کرتے تھے اور فرانسیسی زوال پسندوں کی مذمت کرتے ہوئے "شعر محض" کے عنوان سے انہوں نے ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ ان کا وقت تحریک اور تخلیق میں صرف ہوتا تھا۔ پھر بھی یہ بات نہیں مانی جا سکتی کہ جیمس جوائس کی

کتاب ان کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ وہ کتاب جسے محمد حسن عسکری نے ''ماڈرن فکشن کی باتیں'' قرار دیا تھا اور جس کے وہ بڑے مداح تھے۔ سجاد ظہیر کے لیے تحریک بہت اہم تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ہندی، مرہٹی، بنگالی، اُردو اور دوسری کئی زبانوں کے لکھنے والوں کا ایسا بڑا قافلہ منظر عام پر نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ساری زبانوں کی مشترکہ کوششوں سے جو تحریک چلی تھی اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے۔

چھا گئی آشفتہ ہوکر وسعت افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشت غبار

وہ بھی جو ترقی پسندی کی راہ سے الگ ہوئے ان کی تحریروں میں بھی اس تحریک کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات'' سات ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں شعور کی رو کی تکنیک کا بڑی چابک دستی سے استعمال کیا گیا ہے جو ایک منزل پر خود کلامی بن جاتی ہے۔ اس میں شعور کے مناظر میں جو مناسبت پائی جاتی ہے اس پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔

اس میں کردار نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری اور فضا آفرینی سب کا حیرت انگیز اجتماع ملتا ہے لیکن ایک چیز جو سب پر حاوی ہے، وہ تحریک ہے۔ سجاد ظہیر اپنے نظریات سے کبھی جدا نہیں ہوئے اور ان کے کرداروں کے فکری روّیے بھی اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی کردار نگاری خصوصی اہمیت رکھتی ہے اور پیش کردہ واقعات کے سب سلسلے کردار نگاری کو توانائی بخشتے ہیں۔

اس تحریک کا بنیادی نکتہ فاشزم کے خلاف جدوجہد تھا۔ فسطائی طاقتیں منظم تھیں۔ فسطائیت ایک نظریۂ زندگی ہے۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۵ء سے سجاد ظہیر جہاں انہیں موقع ملا وہ تحریک کے لیے کام کرتے رہے۔ الٰہ آباد میں ہندوستانی اکادمی الٰہ آباد کے جلسے، جس میں فراق گورکھپوری، اعجاز حسین، احتشام حسین، وقار عظیم جیسے ادیبوں نے شرکت کی مینی فسٹو پڑھا گیا اور سب نے بالاتفاق اس پر دستخط کر دیے۔ دستخط کرنے والوں میں سب سے پہلے شخص مولوی عبدالحق تھے۔ سجاد ظہیر کو انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ صرف وہی نہیں ترقی پسند تحریک کا ساتھ دینے والوں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی سبط حسن، عزیز احمد اور محمد حسن عسکری بھی شامل تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ جدید افسانہ ان سے ہی عبارت ہے۔ ترقی پسندوں کی پہلی میٹنگ لندن کے نان کنگ ریسٹوران میں منعقد ہوئی تھی۔

ترقی پسندوں کے بڑے قافلے میں سونیتی کمار چٹرجی کے علاوہ اختر شیرانی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، فیروز الدین منصور، رشید جہاں، خواجہ احمد عباس چراغ حسن حسرت، میاں بشیر احمد اور فیض جیسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی شخصیتوں کو اسی گروہ میں شامل کر سکتے ہیں۔

سجاد ظہیر نے سیاست اور صحافت میں جو کارنامے انجام دیے ہیں ان میں ان کے وہ ترجمے بھی شامل ہیں جو انہوں نے ہندی، انگریزی، بنگالی اور روسی کہانیوں کے پوری فنی مہارت کے ساتھ کیے۔ اس کے علاوہ ان کی ''روشنائی'' بعض اہم خاکوں کو روشناس کراتی ہے۔ اگر صرف خاکہ نگاری کو پیش نظر رکھا جائے تو اس میں بعض اہم ادیبوں اور شخصیتوں کی قلمی تصویروں کو جس طرح سجاد ظہیر نے پیش کیا ہے اس میں تخلیقی شان پائی جاتی ہے۔ دل آزاری کے بغیر ان کی خصوصیات سمٹ آئی ہیں۔ کئی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر ان کے دیباچے بھی اب یادگار حیثیت رکھتے ہیں ان کی کتاب ''روشنائی'' دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب ''روشنائی'' کے علاوہ ان کے رضیہ سجاد ظہیر کے نام خطوط جو ''نقوشِ زنداں'' کے نام سے شائع ہوئے وہ مزاج دانی اور محبت کا نہایت نفیس مظہر ہیں۔ ان کے بعض اہم سیاسی اور تہذیبی مضامین بھی الگ نوعیت رکھتے ہیں۔ سجاد ظہیر جن کی ساری زندگی ادب اور تہذیب کی پرداخت میں گزری، چاہیں بھی تو اپنے سیاسی مضامین میں بھی تہذیبی اقدار سے الگ نہیں ہو سکتے۔ ان کی ایک اور اہم کتاب ''ہندی اُردو ہندوستانی'' ہے جس سے استفادے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ محض خاکہ نگاری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ''روشنائی'' کی قدر و قیمت کو کم نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر طلعت گل نے ان کے رپورتاژ کا سنِ اشاعت ۱۹۳۶ء کی بجائے ۱۹۴۰ء لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس موضوع پر انہوں نے کافی شواہد جمع کر لیے ہوں گے۔ اس کے علاوہ بھی سجاد ظہیر نے کئی رپورتاژ لکھے۔ لیکن ۱۹۳۵ء کی اہمیت بھی کم نہیں کی جاسکتی۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں کہ ''۱۹۳۵ء کا سال تھا میں اس زمانے میں لندن میں اپنی طالب علمی کے آخری دن گزار رہا تھا۔ وہ زندگی جس میں کچھ مہینے بعد میں پوری طرح پڑ جانے والا تھا۔ قانون جسے پڑھنے کے لیے میں لندن میں ٹھہرا تھا۔ میرے لیے ایک چھوٹی سی چیز ہو کر رہ گیا تھا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے یورپ میں خاص طور پر اور طریقے پر ساری دنیا میں جو دن بدن تبدیلیاں ہوئیں جو معلوم ہوتا ہے ایک زمانہ مٹ رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کے آغاز ہیں۔ اس کا نقشہ ہر گھڑی رہتا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ زمانی فاصلہ شاید اتنا زیادہ نہ ہو۔ یہ تحریر بہت کچھ بتاتی ہے۔ ایک ان کا زبردست رپورتاژ ''سر اُٹھا کر چھاؤں میں جو تیغ و خنجر کی چلے'' ہے جو ویت نام کے بارے میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''ایک ادیب اور تہذیبی کارکن کی حیثیت سے ذہنی طور پر بھی اور اخلاقی و جذباتی طور پر بھی اپنے وجود کی اتھاہ گہرائیوں کے ساتھ کبھی اتنا متاثر اور متحرک نہیں ہوا تھا جتنا کہ حریت پسند سرفروشوں کی اس سرزمین پر اپنے مختصر سے قیام کے دوران ہوا۔'' ویت نام کے لوگوں نے نوآبادیاتی محکومی کے نظام کو پوری طرح دفن کرنے کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ان کا ایک اور اہم رپورتاژ ''افریقی ایشیائی ادیبوں کے قافلے کا سفر'' ہے جس میں وہ اپنے سیاسی اور تہذیبی شعور کے ساتھ پوری طرح موجود ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ایک خطبۂ صدارت میں میر کی شاعری کو فراری بتایا۔ مرزا شوق لکھنوی کی ''زہر عشق'' کی تنقید کی۔ سجاد ظہیر نے ایسے غلط رجحانات کی نفی کی ہے اور کہا ہے کہ ''وہ ماضی کی زندگی اور انسانیت سے بھرپور عشقیہ شاعری کو پسند نہیں کرتے اس سے مستفید نہیں ہوتے اس کو بیکار اور نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم ماضی کے عظیم ورثے کو مسترد کرتے ہیں۔'' ظ۔ انصاری نے حافظ شیرازی پر فراریت اور عیش کوشی کا الزام عائد کیا۔ اس کے جواب میں سجاد ظہیر نے ''ذکر حافظ'' میں لکھا ''مجھے غصہ آ گیا۔ یہ کیا کفر پھیلایا کرتے ہو۔ حافظ کے متعلق ایسی سرگرمی لاحول ولاقوۃ''۔ ''ذکر حافظ'' سے ان کے مارکسی خیالات کھل کر سامنے آتے ہیں۔ یہاں جی چاہتا ہے کہ شکریے کے ساتھ ''انگارے'' سے ''پگھلا نیلم'' تک کی بات کی جائے۔

یہ ان کے ایسے خیالات ہیں جو غیر مارکسی نہیں بلکہ خالصتاً مارکسی ہونے کی دلیل ہیں۔ جی چاہے تو کرسٹوفر کاڈویل کی **Studies in a dying Culture** یا **Illusion and Reality** یا **Further Studies in a dynig Culture** کا مطالعہ کیا جائے، جس میں وہ کہتا ہے کہ ادب کو سمجھاتے ہوئے ہمیشہ آسانی رہتی ہے کہ اگر اس کے ادبی اور نا ادبی رُخوں کا الگ الگ تجزیہ کیا جائے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے جو حاصل سامنے آتا ہے، اس کی تفہیم میں آسانی نہیں ہوگی کیونکہ وہ ناقابلِ تقسیم بن چکا ہوتا ہے۔ البتہ ادبی تصورات اور انسانی تاریخ کا رشتہ نسبتاً قابل فہم ہوتا ہے۔ بعض اوقات ادب کے گہرے مطالعے سے تربیت یافتہ حسیات خود ادبی شعور کا آئینہ بن جاتی ہیں۔ لیکن ان کی صداقت کو پرکھنے کے لیے خارجی احوال اور رجحانات کے امتزاج کو سمجھنے کی ضرورت جاتی رہتی ہے۔

سجاد ظہیر ''زہر عشق'' کے تجزیے سے اختلاف کرتے ہیں کیونکہ یہی رویہ برطانوی سامراجیوں اور لکھنؤ کے نوابوں کا بھی تھا۔ جنہوں نے مثنوی ''زہر عشق'' کی اشاعت اور طباعت کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ یہی رویہ غیر مہذب رئیسوں، امیروں اور ان کے خوشہ چینوں کا ہے۔ خود سجاد ظہیر کو ''انگارے'' کی اشاعت کے بعد ایسی ہی بہتان طرازی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ اس کے نکتہ چیں جہالت اور تنزل کے علم بردار تھے۔ وہ نامکمل بے حس اور مجہول رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن ترقی پسندوں کے ایسے خیالات موجب حیرت ہیں۔

ہنری جیمس سے لے کر جیمس جوائس تک شعور کی رو کی تکنیک نے ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ ہنری جیمس کی وفات کے پانچ یا چھ سال بعد **Ulysses** شائع ہوئی۔ تحقیق کار زیب النساء نے ایک اور مماثلت بھی تلاش کی ہے ۱۹۳۶ء میں پریم چند کا انتقال ہوتا ہے اور ۱۹۳۶ ہی میں سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات'' منظر عام پر آتا ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' کے سات سو صفحات ایک دن یعنی جون ۱۹۰۴ء کی کیفیات اور احوال پر مبنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سات سو صفحات میں چارلس ڈکنز کے پلاٹ کا استحکام نہیں ہوسکتا۔ اس میں چارلس ڈکنز کے برخلاف جیمس جوائس کے ناقدوں نے اس کے ڈھیلے ڈھالے پن کی شکایت کی ہے۔ اس لیے جہاں اس کی بڑی

تعریف ہوئی وہاں اس کی سخت مذمت بھی کی گئی۔ ''لندن کی ایک رات'' ایک رات کی سرگزشت ہے لیکن اس میں کہانی پورے استحکام کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور اس میں وہ ڈھیلا ڈھالا پن نہیں جو جیمس جوائس کے یہاں ملتا ہے۔

جیمس جوائس بھی باطنی زندگی کا انکشاف کرتا ہے۔ لیکن ''لندن کی ایک رات'' کا موضوع گٹھا ہوا اور مربوط ہے۔ شعور کی رو کی تکنیک سے فائدہ ضرور اٹھایا گیا ہے۔ لیکن اس کا بنیادی ڈھانچہ مستحکم رہتا ہے۔ اور اس میں سماجی موضوعات کی جو حقیقت پسندی پائی جاتی ہے اس نے اسے جیمس جوائس کے پلاٹ سے زیادہ مربوط و مستحکم بنا دیا ہے۔ جس میں سماجی موضوعات کی حقیقت نگاری کے علاوہ صورتِ حال کو اپنی مرضی سے حل کرنے کا انداز زیادہ ملتا ہے اور اس میں اس تخلیقی قوت کی کمی ملتی ہے جس نے ''لندن کی ایک رات'' کو زیبائی بخشی ہے۔ سجاد ظہیر کی شعور کی رو کی تکنیک زیادہ کارگر ہے کیونکہ اس میں کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کے ساتھ ماضی و حال کا سلسلہ نہیں ٹوٹنے پاتا۔ ''لندن کی ایک رات'' ایک محبت کی کہانی ہے۔ لیکن یہ محبت کی کہانی سے کچھ زیادہ بھی ہے۔ اس میں بہت سی ان کہی باتیں بھی آجاتی ہیں اس محبت میں اذیت، بے بسی، وحشت اور لاچاری سب جھلکتی ہیں پھر ان کی سماجی حقیقت نگاری خود مکتفی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''ہندوستانی اسی لائق ہیں۔ کمینے، ذلیل بزدل، جوتا کھاتے ہیں مگر انگریزوں کی خوشامد سے باز نہیں آتے۔ اور ''زندگی اتنی سہل بھی نہیں جتنی ہم سمجھے ہوئے ہیں''۔ ''مشین گنیں، سنگینیں، سب ہی کچھ برطانوی سامراج کے ساتھ رہیں۔ دس انگریز سپاہیوں نے دس ہزار نیٹوز کو فساد کرنے سے روکا ایک گورا زخمی ہوا اور پندرہ نیٹوز کی جان گئی۔'' ''یہ دنیا بھر میں گولیاں چلا کر اور آسمان سے بم برسا کر تہذیب پھیلاتا اور صلح دامن قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں''۔ ''یہ انگریزی مزدور غالباً اتنے احمق نہیں جتنے انگلستان کے اخبار ''ڈیلی میل'' وغیرہ ان کے دلوں میں سچائی کے لیے ابھی تھوڑی سی جگہ باقی ہے۔'' ''یہی مزدوروں کی قوت ہے جس سے سامراج کو دہشت محسوس ہوتی ہے۔'' جب کبھی ہم مزدور اسٹرائک کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو یہ اخبار قصور ہمارا ہی بتاتے ہیں۔ نعیم الدین ان طالب علموں میں سے تھا جو انگلستان سے جیسے چپک سے جاتے ہیں۔ لیکن نعیم الدین ہمیشہ محبت اور مدد پر مستعد رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ''کسی کی معشوقہ اگر اسے داغ فراق دے جاتی تو وہ دل جوئی کے لیے نعیم کے یہاں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے کردار کو کون نہ پسند کرے گا؟ یہ منظر بھی ملاحظہ ہو ''آگ دہک رہی تھی اور اس کے اُبھرتے ہوئے شعلوں کی روشنی رہ رہ کی اس لڑکی کے چہرے کو چمکا دیتی۔'' لیکن نعیم اور عشق کے درمیان اس کی توند حائل ہے۔ ''اس محنت کی اُجرت اس کا انعام'' زندگی۔ لڑکی نے بہت دھیرے سے کہا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ حسرت ماضی کی باتیں کرنے والے اس درد اور المیہ کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ عارف اور کریم دونوں ان لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے لیے سجاد ظہیر نے استعمال کیا ہے سکارف ہندوستان کے حاکموں میں شمار کیے جانے کا خواہش مند ہے

اور اس نے اپنے آپ کو اس خواہش کا اسیر بنا رکھا ہے۔ کریمہ حقارت سے شیلا گرین کے لیے کہتی ہے کہ ''ایک بات بھی تو شریف زادیوں سی نہیں۔ کسی مزدور اٹھائی گیرے کی لڑکی راؤ اور احسان اس گروہ سے الگ ہیں۔ ''اب پنج ہزاری سردار صاحب کے صاحب زادے اور راجپوت سورما دونوں، بڑے فخر سے انگریزوں کے بوٹ کی نوک چاٹتے ہیں۔'' جین اعظم کی محبوبہ ہے مگر اسے عشق کے ہاتھوں ستم زیادہ برداشت کرنا ہوتے ہیں۔ ہر کردار ایک دوسرے سے الگ ہے اور ان کے تصادمات بھی الگ۔

ان تصادمات میں سیاسی تصادمات بھی شامل ہیں۔ شیلا گرین کے بھی ذہنی تصادمات ہیں لیکن حقیقت خیزی کا ان میں بھی سراغ ملتا ہے۔ اس ناول کے کرداروں میں اعظم راؤ حسین نعیم الدین شیلا، احسان، عارف شیلا گرین سب ہی لندن میں بسنے والے مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن جین کی ایک باطنی زندگی بھی ہے وہ ایک بنگالی لڑکے ہیرن پالی سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے لیکن وہ پاکیزہ کردار رکھتی ہے۔ نمائش اور مجہول نہیں۔ وہ خواہش رکھتی ہے کہ ''زیادہ خوشیوں، زیادہ وسیع مسرتوں کی جستجو کریں جو صرف ہماری ذات تک محدود نہ ہو، بلکہ جن میں تمام انسانیت شریک ہو۔ ہیرن کے سامنے بھی ایک مقصد ہے وہ ہندوستان کے کروڑوں غلام و محکوم عوام کی ذلت، جہالت اور تاریکی کے گڑھے سے باہر نکالنے کا مقصد ہے۔ ہیرن پالی سے محبت کا انجام بھی ایک بڑے المیہ سے کم نہیں۔ نعیم سے بتاتا ہے کہ ہندوستان میں قید ہے ان کے لیے مجرم ہونا ضروری نہیں۔ وہاں آزادی خواہ نوجوان زیادہ دنوں آزاد نہیں رہ سکتے۔ آزادی کی خواہش ہی کافی ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' کا آخری منظر بھی عجیب شان رکھتا ہے۔ ''آگ بجھ گئی کمرے میں ٹھنڈک بڑھ گئی۔ صبح کی پھیکی روشنی چور کی طرح کھڑکی کے راستے دبے قدم اندر آنے لگی۔''

فیض نے سجاد ظہیر کی نثری شاعری کا پرچہ ترکیب استعمال پوچھا تھا۔ لیکن نہ انہوں نے فیض کی تردید کی اور نہ پریم چند کی۔ وہ شاید طنز سے کام لے سکتے تھے جیسے انہوں نے ہنس راج رہبر اور ظ۔ انصاری میں استعمال کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جہاں دوسروں پر تنقید کرتے تھے وہاں اپنے آپ پر ہونے والی تنقید کا تحمل بھی کر سکتے تھے۔ یہی ان کی بصیرت اور بڑائی تھی جس نے سجاد ظہیر کو اپنے دور کی نابغہ روزگار شخصیت بنایا اور ان کے ناول ''لندن کی ایک رات'' کو اردو ناول کی تاریخ میں ناقابل فراموش بنا دیا۔

❁❁

Address:

حسین الحق

پریم چند کا موضوعاتی تنوع

تخلیقی فنکاروں میں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور پریم چند پر اتنا کچھ لکھا جا چکا اور ان فنکاروں کی اتنی جہات کا جائزہ لیا جا چکا کہ اب ان میں سے کسی پر کچھ ایسا لکھنا جو تکرارِ خیال کے مصداق نہ ہو، جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان فنکاروں نے زندگی کا اتنی تفصیلا ,, گہرائی اور باریکی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے کہ انہیں پڑھے بغیر اور ان پر سوچے بغیر اس وسیع تر برِّ صغیر ایشیاء کی اجتماعی تہذیبی زندگی اور اس کے مختلف تمدنی اور عمرانی مظاہر سے واقف ہی نہیں ہوا جا سکتا۔

پریم چند کا معاملہ یوں بھی مختلف ہے کہ پریم چند کو بیک وقت اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کا ادیب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس طرح جہاں پریم چند کا حلقہ اثر وسیع ہو جاتا ہے وہیں اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ پریم چند اپنے عہد کے وہ اکیلے افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں جنہوں نے ہندوستان کا مطالعہ کرنے کے سلسلے میں وسیع القلبی اور وسعتِ مکانی دونوں کا ثبوت دیا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ گاندھی جی کی طرح پریم چند کو بھی ہندوستان کی صرف عظیم رُوح نہیں بلکہ ''وسیع رُوح'' ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ آج ہندوستان کو عظیم روحوں سے زیادہ وسیع اور وسیع القلب رُوحوں کی ضرورت ہے تا کہ وہ اپنے پھیلاؤ میں پورے ہندوستان کو سمیٹ سکیں۔

پریم چند ہی نے کسی جگہ کہا ہے کہ ''تاریخ میں سب جھوٹ ہوتا ہے سوا نام کے اور کہانی میں سب سچ ہوتا ہے سوا نام کے''۔ ممکن ہے تاریخ کے سلسلے میں پریم چند کا یہ قول ادھوری صداقت ہو مگر کہانی کے بارے میں یہ سو فیصد صحیح ہے۔ ہماری تہذیب کا سارا لکھا جوکھا اس کے خارجی اور داخلی تصادمات، قومی اور ذاتی آرزوئیں، تمنائیں اور کوششیں اس تہذیب میں سانس لیتے ہوئے کرداروں کا سماجی اور ذاتی ذہنی زاویہ اگر کہیں پوری سچائی اور جزئیات کے ساتھ تلاش کیا جا سکتا ہے تو صرف ان کی فنِ قصہ گوئی میں تھا۔

اور اس میں پریم چند کی اصل اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ ہیرو کا چہرہ بدل دیا، کل تک جس ہیرو پر بادشاہ شہزادہ راجہ اور نواب کا چہرہ لگا ہوا تھا پریم چند نے اس پر عام آدمی کا چہرہ لگا دیا اور کہانی کے ہیرو کا یہ اصلی چہرہ ہے۔ اس سے پہلے جو چہرہ تھا وہ چہرہ نہیں تھا مکھوٹا تھا۔ یہی نہیں ، پریم چند نے پہلی مرتبہ اُردو، ہندی ادب کے

قاری کو دربار سے اٹھا کر کھیتوں کھلیانوں پنچائتوں اور بازاروں تک پہنچادیا۔ یہ عام آدمی (جو آج کی کہانی کا ہیرو ہے) دربار میں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور بادشاہ سلامت کے آگے منہ کھولنے سے پہلے جان کی امان مانگتا تھا مگر جب یہ دربار سے اٹھ گیا تو دربار خوف بھی دل سے جاتا رہا۔ پریم چند کے کرداروں میں پہلی مرتبہ عام آدمی کی صدائے احتجاج سنائی دیتی ہے اور صدیوں پر محیط کرپٹ مہاجنی اور زمین دارانہ نظام کے خلاف عام آدمی نڈر ہو کر بولتا ہے، کبھی کفن، بوڑھی کاکی، پوس کی رات، سوا سیر گیہوں اور کشمکش میں، تو کبھی بازارِ حسن، میدان عمل اور ''گئودان'' میں۔

اس طرح کی باتیں مسلسل کہی جاتی رہی ہیں:

علی جواد زیدی کہتے ہیں:

پریم چند کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے وہ دیہاتی زندگی کی صحیح اور ہو بہو مرقع کشی ہے (زمانہ پریم چند نمبر، ۱۹۳۷ء)

جعفر رضا کا خیال ہے کہ:

پریم چند اپنی عصری زندگی کے ترجمان ہیں۔ وہ حقائقِ زندگی کے اتنے قریب تھے کہ ان کے پیش کردہ حقائق اس زمانے کے کسی بھی گاؤں میں دیکھے جاسکتے تھے۔ (پریم چند کہانی کا رہنما، ص:۱۳۰)

ڈاکٹر مسیح الزماں فرماتے ہیں:

پریم چند اُردو کے کہانی کاروں میں اس بنا پر بھی فوقیت رکھتے ہیں کہ انہوں نے گاؤں کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ (معیار و میزان، ص:۱۰۹)

پروفیسر احتشام حسین کا کہنا ہے کہ: یہ پریم چند کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے محنت کش عوام کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا ہیرو بنایا، پریم چند پہلے ادیب ہیں جنہوں نے شعوری طور پر عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف یہ قدم بڑھایا۔ (پیش لفظ۔ پریم چند، ص:۱۳)

ڈاکٹر قمر رئیس رقم طراز ہیں:

پریم چند پہلے ادیب ہیں جنہوں نے ہندوستانی گاؤں کے کسانوں، کھیت مزدوروں اور ہریجنوں کی عظمت اور انسانی وقار کو سمجھا۔ ان کے لیے ادب کے کشادہ دروازے کھولے اور انہیں ہیرو بنا کر ان کے دُکھ سکھ کی گاتھا سنا کر اُردو کے افسانوی ادب کو نئی وسعتوں اور ایک نئے احساس جمال سے آشنا کیا۔

(پریم چند۔ فکر و فن، ص:۸۸)

مذکورہ بالا پانچ اقتباسات میں ناقدوں کا بنیادی نقطہ ارتکاز گاؤں دیہات کھیت کھلیان مزدور اور ہریجن ہے۔ میں بھی پریم چند کے اس اختصاص کا قائل ہوں مگر پریم چند کو پڑھتے ہوئے ان کے کچھ اور خیالات بھی مہمیز

کرتے ہیں، مثلاً ایک جگہ پریم چند نے لکھایا کہا کہ ''ادیب جو کچھ لکھتا ہے اپنے باطن کی کرید سے لکھتا ہے'' (پریم چند گھر میں۔ مصنفہ: شیورانی، ص:۱۴۹) ایک دوسرے مضمون میں ادب کے مقصد پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا: ''پروپیگنڈے میں اگر ذاتی اشاعت نہ بھی ہو تو ایک مخصوص مقصد کو پورا کرنے کی وہ تمنا ہوتی ہے، جو ذرائع کی پروا نہیں کرتی۔ ادب ہلکی سہانی ہوا ہے جو سب کو فرحت اور مسرت دیتی ہے۔ پروپیگنڈہ آندھی ہے جو آنکھوں میں دھول جھونکتی ہے۔ ہرے بھرے درختوں کو اُکھاڑ پھینکتی ہے جھونپڑوں اور محلوں دونوں کو ہلا دیتی ہے۔ وہ لطف سے خالی ہونے کی بنا پر مسرت کی چیز نہیں...... اگر وہ سچائی اور حسن کے قریب لے جاتا ہے تو ادب ہے، نہیں لے جاتا تو پروپیگنڈا یا اس سے بھی ذلیل (پریم چند۔ ساہتیہ کا ادیشہ۔ ماخذ: پریم چند کہانی کا رہنما، ص:۸۱) پھر ایک جگہ پڑھا: ''ہم نے آفتاب کا طلوع و غروب دیکھا ہے، شفق کی سرخی دیکھی ہے، خوشنما اور خوشبو دار پھول دیکھے ہیں، خوش نوا چڑیاں دیکھی ہیں، نغمہ خواں ندیاں دیکھی ہیں، ناچتے ہوئے آبشار دیکھے ہیں...... اسی کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقصد اولیٰ ہے (ادب کی غرض و غایت۔ پریم چند۔ زمانہ اپریل ۱۹۳۶ ماخذ: پریم چند۔ کہانی کا رہنما۔ ڈاکٹر جعفر رضا، ص:۸۴)

ان اقتباسات کے ذریعہ ایک نئے پریم چند سے میری ملاقات ہوئی۔ اُردو اور ہندی والوں کے مقبول عام پریم چند، ممکن ہے گاندھیائی ہوں، رام پرجیہ کا تصور رکھتے ہوں، شعر و افسانہ کو خدائی انعام سمجھتے ہوں، گاؤں دیہات، کھیت کھلیان، مزدور، ہریجن، آزادی، انقلاب، سوشلزم اور مساوات کے حامی اور جانب دار ہوں، چھوا چھوت کے خلاف ہوں اور عقدِ بیوگان کے علمبردار ہوں مگر پریم چند کے مذکورہ بالا اور ایسے متعدد خیالات کی چھتر چھایا میں جب میں پریم چند کی تحریروں سے کرداروں سے ماحول سے ان کے افسانوں واقع ہونے والے چھوٹے بڑے خیالات سے ڈسکورس کرنے لگا تو احساس ہوا کہ یہ آدمی تو دراصل انسانی سروکار رکھنے والا آدمی ہے۔ اسے نظریاتی بندشوں میں قید کرنا اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا کیونکہ اس شخص۔ پریم چند کے یہاں موضوعات کا ایسا تنوع اور انسانی سروکار کی ایسی ایسی پرچھائیاں کانپتی جھلملاتی نظر آتی ہیں کہ پریم چند پر پیار آنے لگتا ہے اور ان کے ناقدوں سے اُلجھن ہونے لگتی ہے کہ انسان اور اس کے اِردگرد کی پوری کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرنے والے فنکار کو ناقدوں اور خاص طور پر نصابی ناقدوں نے چند موضوعات کے حصار میں قید کر ڈالا ہے ورنہ موضوعاتی تنوع کے نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو بالکل سامنے کی بات ہے کہ (۱) ''پنچائیت'' انسانی داخل میں موجود نیکی کی جبلت کا اشارہ بن جاتی ہے۔ عام حالات میں یہ جبلت خوابیدہ رہتی ہے اور جبلت کے منفی پہلو انسان کو اِدھر اُدھر سرگرداں رکھتے ہیں مگر انسان خود یا اس کے حالات بہتر اقدار کے کسی ایک نکتے پر بھی ارتکاز کرتے ہیں تو یہ نیکی کی جبلت کے سر اٹھانے اور فعال ہونے کا لمحہ ہوتا ہے، (۲) ''اندھیر'' اقتدار کے کوتاہ چہرے اور عوام کے توہمات کا آئینہ ہے۔ جو بھی اقتدار کا حصہ یا نمائندہ بنتا ہے وہ بے ایمان ہو جاتا ہے جیسے اس

کہانی کا کھیا۔ دوسری طرف عوام ہیں جو اپنی جہالتوں کے سبب خود پیدا کردہ مصیبتوں کو دیوی دیوتاؤں کا شراپ ،
سمجھ لیتے ہیں اور گلو خلاصی کی ایسی صورتوں پر خوش ہوتے ہیں جن کی مضحکہ خیزی افسانہ "اندھیر" میں جھل جھل
جھلک رہی ہے۔ جہالت کے اس گھنے اندھیرے میں اُمید کی صرف ایک کرن اس کہانی کا مرکزی کردار گوپال
ہے جو یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ ستیہ نرائن کی مہمانہیں اندھیر ہے (۳) "آہ بیکس" قدرت کے قانونِ مکافات کے
طاقت ور ہونے کا اشاریہ ہے (۴) "عیدگاہ" مختلف لجیات افسانہ ہے۔ جس کا پہلا رُخ تیوہار کی منظر کشی کا ہے
دوسرا رُخ بچوں کی نفسیات پر مبنی ہے، تیسرا رُخ تہذیب کے اس منظر نامے کا ہے جو کسی تہذیب میں موجود آرٹ
اور کرافٹ سے متعلق فنکارانہ سرگرمیوں کا لکھا جوکھا پیش کرتا ہے۔ پریم چند نے اس عہد کے تہذیبی تجسس
(cultral thrust) کو گڑیوں، کھلونوں اور دست کاری کے دگر نمونوں کے حوالے سے تلاش کرنے کی کوشش کی
ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالباً "عیدگاہ" اُردو میں انی سی ایشن کی پہلی کہانی قرار پائے گی۔ پھر حامد محمود اور
دوسرے بچوں کے حوالے سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عید کی نماز کے وقت تو ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و
ایاز مگر نماز کے بعد ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی حامد دشتِ غربت کا مسافر بن جاتا ہے اور دوسرے خوش حال بچے
گلشنِ امارت کے سیاح (۵) "دو بیل" اس بنیادی خیال کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ محبت اور وفاداری صرف
انسان کی میراث نہیں یہ تو کائنات کے ہر ذی رُوح عنصر کی بنیادی جبلت کا ایک حصہ ہے (۶) "بوڑھی کاکی"
سماج میں موجود لاوارثوں کا ایک حزنیہ بلکہ المیہ ہے۔ جس کے ذریعہ پریم چند نے دکھایا ہے کہ استحصال صرف
دلتوں اور پسماندہ طبقات کا نہیں ہوتا یہاں تو اپنے اپنوں کا بھی استحصال کرتے ہیں۔ "بوڑھی کاکی" پڑھ کر
اچانک ساحر لدھیانوی کا ایک مصرع بھی یاد آیا۔ مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے۔ کہانی میں جو بشری سروکار
(human discourse) چاہیے اس رُخ سے یہ کہانی احساس دلاتی ہے کہ انسانیت کا اصل اثاثہ تو بچے اور
ان کی معصومیت ہے۔ بوڑھی کاکی کے بھتیجے بدھورام کی بیوی روپا کا جو آخری کرداری تفاعل ہے وہ دراصل نیکی
اور اچھائی کے اس ننھے سے جگنو کو مٹھی میں محفوظ کر لینے کی کوشش ہے اور بُرائی کرتے کرتے اچانک نیکی اور اچھائی
کے سر اُٹھا لینے کا جواز باقی رکھتا ہے (۷) "پسنہاری کا کنواں" بظاہر تو رومانی اندازِ فکر سے مملو دکھائی دیتی ہے لیکن
اس کہانی میں متھ دیو مالا جس طرح ایک فعال عنصر کی طرح سماج اور افراد پر اثر انداز ہوتی دکھائی دیتی ہے وہ
تہذیب وتمدن کے ارتقاء میں متھ اور اساطیر کی طرف پریم چند کے اگر ہمدردانہ نہ بھی سہی تو غیر جانبدارانہ روّیے کا
بہر حال ثبوت ہے (۸) "شطرنج کے کھلاڑی" ایک بہت ہی خوب صورت اور فنی طور پر نک سک سے درست
کہانی ہے جو تاریخی پس منظر میں ان لوگوں پر اظہار افسوس اور حرفِ افسوس کا استعارہ ہے۔ جو انفرادی سطح پر تو تیغ
بے نیام ہو جاتے ہیں مگر اجتماعی مفادات کی خاطر اپنی طاقتوں کا استعمال نہیں کرتے۔ یہ کہانی تاریخ کے پسِ منظر
میں خود غرضی اور ایثار کے فرق کو نمایاں کرتی ہے۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد مختلف خود مختار ریاستوں میں

انفرادی تفاعل نے جس طرح خودغرضی کا روپ دھارا تھا اس کا ایک بہترین نمونہ "شطرنج کے کھلاڑی" ہے (۹) "نئی نئی بیوی" میں انسانی سماج اور معاملت کا ایک بہت ہی نازک رخ نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ کہانی فطری عوامل کے طاقت ور ہونے کا اشاریہ ہے، انسان اپنی طاقت اور دولت کے نشے میں خود اپنے آپ کو کتنا ہی فریب کیوں نہ دے۔ مگر فطرت کے جو تقاضے ہیں ان سے منہ موڑ کر جی نہیں سکتا اور جذبات کا جو پُرشور سمندر ہے اس پر غیر فطری انداز میں باندھا گیا ہر بندھ بالآخر زمیں بوس ہو جائے گا (۱۰) "ریاست کا دیوان" میں بظاہر تو زمیندارانہ نظام کا کریہہ چہرہ دکھایا گیا ہے مگر اس کے پس پردہ انسانی فطرت میں موجود اس جبلت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو جھوٹ مکر اور ظلم کے ساتھ بہت دور تک نہیں چل پاتی، گویا پریم چند کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ضمیر فروشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے (۱۱) اسی طرح "پوس کی رات" میں بھی افسانے کی اوپری پرت تو غریبوں کی زندگی کا ایک کپکپا دینے والا منظر پیش کرتی ہے مگر افسانے کی اندرونی ساخت اور بنت میں بے زبان جانوروں کی وفاداری کی جو کتھا بیان کی گئی ہے وہ اس کہانی کے کتنے جبرا کے واسطے سے "دو بیل" کے ہیرا موتی اور "دودھ کی قیمت" کے ٹامی کی یاد دلاتی ہے دراصل پریم چند کے بیانیہ کی ایک خاص خصوصیت رومانی اور حقیقی انداز کا امتزاج ہے (۱۲) "گھاس والی" انسانی رشتوں کی تہہ در تہہ پیچیدگیاں تلاش کرتی ہے اور بیان کرتی ہے۔ چین سنگھ کی ہوس جب ملیا کی پُرسکون بے ہوس، مگر وفادار طبیعت سے ٹکراتی ہے تو شروع میں ڈر لگتا ہے کہ شاید یہاں بھی کمزور اور زبردست کی روایتی کہانی بیان کی جائے گی مگر پریم چند نے بڑے فنکارانہ انداز میں محبت اور ہوس کے درمیان اس جذبے کی دریافت کی۔ ہمارے سماجی ڈھانچے میں عورت مرد کے درمیان یا تو محبت تلاش کی جاتی ہے یا ہوس، پتہ نہیں ہمارا معاشرہ اس کو کیوں فراموش کیے رہتا ہے جو نہ تو انسانیت کی طرح مثالی ہے نہ ہوس و حیوانیت کی طرح غیر انسانی (۱۳) "راہِ نجات" دیہی زندگی کی آپسی چپقلش کے درمیان سے سر اٹھاتا ایک ایسا فن پارہ ہے جس میں مصنف کی تخلیقی لاتعلقی (creative detachment) قابلِ تعریف ہے مگر موضوع کے لحاظ سے اس کہانی میں بھی ایک بہت ہی دلچسپ قسم کا نیاپن موجود ہے اور بطور خاص اگر ہم اس کہانی کو پریم چند کے عصری تناظر میں دیکھیں تو احساس ہوگا کہ اس وقت بلکہ اس وقت سے اس وقت تک ہمارا ایک بہت دلچسپ قسم کا تصور یا تاثر یہ ہے کہ عیاری مکاری اور سازش وغیرہ تو بس شہر کے لوگوں کی دانش کا حصہ ہے دیہات کے لوگ تو بہت معصوم، چھل کپٹ سے دور اخلاص و محبت کا پیکر ہوتے ہیں مگر "راہِ نجات" میں اس عام تصور کے برعکس دیہی زندگی میں موجود مکر کو پریم چند نے کہانی کا موضوع بنایا۔ ان کے موضوعاتی تنوع اور انسانی فطرت کی گہرائیوں میں اُتر کر نسلی و علاقائی تعصبات سے اوپر اٹھ کر آدمی کو مجموعی طور پر سمجھنے کی کوشش کا یہ ایک اور بین ثبوت ہے (۱۴) "بند دروازہ" ایک بہت مختصر سی کہانی ہے۔ یہ صرف ایک صفحے میں سما جانے والی کہانی ہے۔ اُردو کی پہلی منی کہانی بھی پریم چند نے لکھی۔ کہانی بظاہر کچھ نہیں۔ یہ صرف اتنی کہ راوی برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ بچہ کھلے دروازے

سے راوی کے پاس آگیا اور کھیلنے لگا، اسی درمیان دروازہ ہوا سے خود بخود بند ہوگیا۔ دروازہ بند ہونے کی ''پٹ'' کی آواز پر بچہ چونکا اور جس فاؤنٹن پن سے وہ ہنستا مسکراتا کھیل رہا تھا اسے پھینک کر روتا ہوا دروازے کی طرف دوڑا کیوں کہ دروازہ بند ہوگیا تھا۔ اس انتہائی مختصر کہانی میں پریم چند نے انسانی فطرت کے اس بنیادی پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دروازے کا بند ہونا کیونکہ انٹر ایکشن کا بند ہونا ہے ایک منظر کا پس پشت چلے جانا ہے، اُمید کے آسماں کا تنگ ہوجاتا ہے، امکانات کا محدود ہوجانا ہے لہٰذا انسانی فطرت بند دروازے سے سمجھوتہ نہیں کرپاتی۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسی شاندار کہانی پر اُردو ناقدوں نے اپنی گفتگو کا دروازہ بند کیوں کررکھا ہے(۱۵)

''اکسیر'' کا بنیادی موضوع محبت کا فاتح عالم ہونا ہے۔ بظاہر موہن اور روپا کی محبت کو بنیاد بناکر لکھی جانے والی کہانی بڑی آہستگی سے بلکہ غیر محسوس طور پر موہن اور روپا کے عاشقانہ معاملات کو کنارے کردیتی ہے اور اس پورے ماحول پر موہن کے بدلے روّیے نے رحمت وشفقت کا ایک ایسا شامیانہ تان دیا، جس کی چھتر چھایا میں اس ماحول میں سانس لینے والا ہر فرد ایک دوسرے کے لیے رحیم بن گیا۔ جو دلوں کو جیت لے وہی زمانہ اس کہانی کا بنیادی موضوع یہی ہے(۱۶) ''کفن'' پریم چند کی اتنی مشہور اور نمائندہ کہانی ہے اور اس پر اتنی باتیں کی گئی ہیں کہ اس پر کچھ عرض کرنا شاید تکرارِ متن ہی ہوجائے لہٰذا بطور حرف ربط عرض ہے کہ اس کہانی کا بنیادی موضوع ہمارے انسانی سماج کے ایک حصے کا dehumanization ہے۔

میں نے سطور ماقبل میں پریم چند کے سولہ افسانوں کے حوالے سے پریم چند کے موضوعاتی تنوع اور انسانی سروکار کو سمجھنے کی ایک کوشش کی۔ اس سلسلے میں (۱) حج اکبر، (۲) فاتحہ، (۳) ڈرامہ کربلا، (۴) کیفر کردار، (۵) خون سفید، (۶) زیور کا ڈبہ، (۷) گلی ڈنڈا، (۸) بعد از مرگ، (۹) دستِ غیب، (۱۰) حسنِ ظن، (۱۱) چکمہ، (۱۳) قیدی، (۱۴) قاتل سوانگ، (۱۵) لاٹری، (۱۶) مالکن وغیرہ کے حوالے سے گفتگو کو اور آگے بھی بڑھایا جاسکتا ہے مگر تمام تر مطالعات کا اجمالی تاثر یہی ہے کہ پریم چند صرف گاؤں دیہات کھیت کھلیان کسان مزدور دلت اور غریب کے ہی افسانہ نگار نہیں ہیں انہوں نے بقول آل احمد سرور ''زندگی کو دیکھا ہے اور پورے طور پر دیکھا ہے۔'' آدمی کو سمجھا ہے اور پورے طور پر سمجھا ہے لہٰذا تخلیقی ہنر اور وفورِ سرجوش موجود ہے جو انہیں کائنات سے جوڑتا بھی ہے اور تخلیقی سطح پر لاتعلق بھی کرتا ہے جیسے ''کفن''، ''بند دروازہ''، ''راہِ نجات''، ''پوس کی رات'' اور ''نئی بیوی'' وغیرہ میں ہوا۔

جنہیں بڑے وثوق سے شاہ کار کہا جاتا ہے۔

❀❀

Address:

Professor Dept. ment of Urdu
Maga 'h University, GAYA, INDIA

فاطمہ حسن

بیدی کی کہانیوں میں عورت

بیدی کی کہانیوں کے حوالے سے میں ان ہی کے جملوں سے آغاز کروں گی جو انہوں نے اپنے ایک پیش لفظ کے اختتام پر لکھے ہیں:

''کہانی ایک بنیادی فن ہے، جو بڑی محنت اور ریاضت سے ہاتھ میں آتا ہے اور دھیرے دھیرے آپ کے رگ و پے میں سرایت کرتا جاتا ہے۔ انسانی احساس کا اساس بن جاتا ہے اور جب کہانی کا ترنم آپ کے بدن میں چلا جائے تو آپ کو سڑک کے ہر کونے کھدرے میں کہانیاں پڑی ہوئی ملیں گی۔ آپ کہانی کو نہیں ڈھونڈیں گے کہانی اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے آپ کو آلے گی۔ اس عورت کی طرح بچہ اس دنیا میں لائے بغیر جس کا جینا بے معنی اور لا حاصل ہے۔''

بیدی کے اس آخری جملے نے مجھے ان کے مطالعے کے اس رُخ کی طرف متوجہ کیا کہ بیدی جو بہت بڑے افسانہ نگار ہیں، عورت دوست سمجھے جاتے ہیں اس کے وجود کے ایک ہی مصرف پر یقین رکھتے ہیں اور وہ ہے بچہ پیدا کرنا۔ اگر بچہ نہ ہو تو اس کا ہونا لا حاصل اور بے معنی ہے۔ ان کی یہ سوچ ہمارے عمومی سماجی روّیے سے مختلف تو نہیں۔

اگر چہ بیدی نسوانی کرداروں کو بڑی ہمدردی اور سوز کے ساتھ لکھتے ہیں ان کا انداز تحریر اور روّیہ دردمندانہ ہوتا ہے مگر بنیادی طور پہ وہ عورت کے اس روایتی کردار پر یقین رکھتے ہیں۔ جو صدیوں سے ہمارے معاشرے میں رائج ہے۔ جس نے عورت کو طوائف، داسی، کنیز، دیشیا بنایا ہے بیوی بن جانے کے باوجود بھی اس کی سطح اور اس سے سلوک اسی سے قریب تر ہوتا ہے جو مذکورہ عورتوں کے لیے ہے اسے مرد کی نفسانی خواہشات کی تکمیل، اس کے بچوں کی پیدائش پرورش اور اس سے متعلقہ تمام افراد کی خدمت کرنا ہے۔ اس کے عوض مرد اسے کھانا، کپڑے اور حسب استطاعت رہائش مہیا کرتا ہے۔ بیدی اپنی کہانیوں میں عورت کے ساتھ زیادتی پر نالاں اور گریہ کناں نظر آتے ہیں کہ وہ ساری زندگی بچے پیدا کرنے کی تکلیف اور ان کی پرورش کی مشقت میں مبتلا رہتی ہے۔ اس کے ساتھ سماجی روّیے ظالمانہ ہیں اس کی ضرورتوں اور آرام کا خیال نہیں رکھا جاتا تاہم وہ عورت کو اس صورت حال سے علیحدہ ایک مکمل ایسے انسانی وجود میں نہیں دیکھتے جہاں وہ بچوں اور گھر کے پردے میں چھپی اس سیاست کو آشکار کریں جو مردوں نے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے بڑی مہارت سے ایک ایسے نظام کو

وجود میں لانے کے لیے چلی ہے۔ جس میں عورت صرف ایک کمزور مہرہ ہے۔ وہ اقدار روایات جو پدرسری معاشرے نے تشکیل دی ہیں اور جس میں عورت کا وجود بحیثیت باشعور انسان کہیں بھی نہیں ہے۔ اس کے احساسات، جذبات تو کیا ضروریات کا ہونا بھی اتنا ہی ہے جتنا کسی پالتو جانور کا۔ بیدی ان تلخ حقائق کو تحریر میں لائے ہیں مثلاً ان کی کہانی ''ہڈیاں اور پھول'' میں تنہائی پسند اور غصیلا موچی ملّم جو بیوی کو پیٹا کرتا تھا کہتا ہے۔

''انہی کتوں کو دیکھ کر گوری نے ایسی بات کی جوان دنوں مجھے بہت ستاتی ہے۔ میں اس سے عموماً جلا کٹا ہی رہتا تھا۔ اسے ذرا ذرا سی بات پر پیٹا کرتا اور کہتا ''ہڈیاں توڑ دوں گا تیری۔'' حالانکہ وہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی تو رہ گئی تھی اور اس کے منہ پر سرسوں کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس دن بھی ڈونگر محلہ کے سب کتے کالی باڑی کے اس بازار میں چلے آئے تھے اور ایک بڑا سا کتا ایک کھجلی ماری کتیا کے سامنے اپنی دم ہلا رہا تھا جیسے بڑا پیار جتا رہا ہو۔ اور گوری تو جانے کا گ بھاشا ہی سمجھتی تھی۔ وہ یہاں، اسی جگہ اسی دہلیز، اسی دروازے کا سہارا لیے کھڑی مسکراتی رہی پھر سامنے کتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو تو وہ کیسے دم ہلا رہا ہے۔''

اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک تنومند کتا بھی کتیا کے بدصورت ہو جانے پر اس کی محبت کا دم بھرے جاتا ہے۔ تو کیا تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتے؟ تم جو ایک شرابی اور بدصورت آدمی ہو۔ روگ تو جی کے ساتھ لگا ہی ہوا ہے اور پہلے میں کتنی تندرست ہوا کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ کتا غرانے لگا اور اپنے اگلے پنجوں سے مٹی کرید کر پیچھے کی جانب پھینکنے لگا شاید وہ اپنے رقیبوں کو مقابلے کے لیے اکساتا تھا۔ لیکن میں نے گوری سے کہا ''دیکھو تو وہ کتنی نفرت کا اظہار کر رہا ہے اسے بھی یہ کھجلی ماری، مریل مادہ پسند نہیں۔''

ایک اور مردانہ رویہ لکھی سنگھ کا ہے جو پڑھا لکھا ہے اور سوشلسٹ ہے۔

''اس وقت لکھی سنگھ کو بھوک لگ رہی تھی اور وہ بسنتو سے لڑنا چاہتا تھا، اس نے بات بال بچوں کی تربیت سے شروع کی اور کہنے لگا بچے تو انگریز عورتوں کو پالنے آتے ہیں ہندوستانی عورتوں کو ماں بننے کا حق نہیں......''

(کہانی آلو)

برصغیر کے سماج میں بچوں کی پرورش اور تربیت صرف عورت کی ذمّہ داری سمجھی جاتی ہے ان کی شرارت، بیماری اور غلط عادتوں کا ذمّہ دار بھی اسے ہی ٹھہرایا جاتا ہے جب کہ درحقیقت بچوں کا آئیڈیل باپ ہوتا ہے۔ مگر اولاد کی بے راہ روی کو ماں کی تربیت کی خامی ہی کہا جاتا ہے اسی طرح وہ بچہ جس کا باپ موجود ہے اور وہ بچہ جو کسی حادثے یا ناجائز تعلق کی بناء پر وجود میں آیا ہے یکساں عورت کی ذمّہ داری ہے، بیدی نے ایسے کرداروں کی بھی نشان دہی کی ہے، جہاں بچے کے باپ کا پتہ نشان نہیں ہے۔ ایسا ایک کردار طوائف کلیانی ہے۔

''کلیانی نے گٹھری کو اٹھالیا اور مہی پت کے پاس لاتے ہوئے بولی ''دیکھو دیکھو میرا بچہ'' مہی پت نے اس

لجلجے چار، پانچ مہینے کے بچے کی طرف دیکھا جسے گود میں اُٹھائے کلیانی کہہ رہی تھی۔ اسی کو ہلکٹ کو پیدا کرنے، دودھ پلانے سے ہم یہ ہوگیا۔ کھانے کو کچھ ملتا نہیں اس پر تم مارتے ہو۔"

بچے کی خاطر کلیانی مہی پت کے دیے ہوئے پانچ روپے قبول کر لیتی ہے اسی طرح افسانہ "ببل" میں بھکارن مصری اپنے بچے کے بارے میں کہتی ہے۔

"اس کا باپ؟" مصری کو جیسے سوچنے میں وقت لگا "نہیں ہے۔"

جواب میں بہت سی باتیں تھیں۔ یہ بھی تھا کہ وہ مر چکا ہے اور یہ بھی کہ مرنے سے بھی بدتر ہوگیا ہے۔ مصری کہیں دور دیکھنے لگی اور پھر درباری لال کی نگاہوں کے تاسف کو دور کرتے ہوئے بولی: "ایک بار پھر وہ آیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہی ہے، لیکن میں کیا کہہ سکتی تھی۔ بابو جی! میں نے تو اسے جی بھر کے دیکھا بھی نہ تھا۔ جب تک میں نے اس بچے کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ کبھی گوپو کبھی ناریاں کہہ کے پکارتی تھی۔ جبھی اس نے اس کے ہاتھ پر پانچ کا ایک نوٹ رکھا اور بڑے پیار سے پکارا: "ببل!" جب سے میں نے اس کا نام ببل رکھ دیا ہے۔"

اور مصری پھر سوچنے لگی: "اس کا باپ نہ ہوتا تو پانچ روپے دیتا؟"

درباری بھی سوچنے لگا: "ہو سکتا ہے وہ آدمی نہیں پانچ روپے کا نوٹ ہی اس بچے کا باپ ہو۔"

یعنی بیدی کے نزدیک عورت صرف اس معاشی تحفظ کی چاہت رکھتی ہے جو اس کا مرد روپے یا چیزوں کی شکل میں اسے مہیا کرتا ہے۔ بیدی کا یہ روّیہ عمومی ہے اور اپنی کہانیوں میں انہوں نے متعدد مقامات پر ہر طبقے کی عورت کے لیے ایک حقیقت کے طور پر اس طرح تسلیم کر لیا ہے کہ اس سے مختلف کچھ اور نظر نہیں آتا ان کے اس روّیے کی توجیہ بھی کہانی "صرف ایک سگریٹ" میں موجود ہے۔

"میں نے بیٹی سے ایسی ایسی باتیں کہیں۔"

جب وہ کالج جا رہی تھی تو میں نے کہا تھا: "وہاں مخلوط تعلیم ہے لاڈو، وہاں لڑکیاں ہوں گی اور لڑکے بھی، اور لڑکے قریب ہونے کی کوشش کریں گے۔ آج کل ہماری معاشرت میں ایک نئی چیز آگئی ہے جسے گڈ ٹائم کہتے ہیں۔ گڈ ٹائم، گڈ ٹائم ہے، لیکن مرد اور عورت میں جو بنیادی فرق ہے، اسے مت بھولنا۔ مرد پر کوئی ذمہ داری نہیں بشرطیکہ وہ اپنے اخلاق، اپنی تہذیب سے اسے قبول نہ کرے، لیکن عورت پر بہت ہے، کیونکہ بچہ اسے اُٹھانا پڑتا ہے۔ اسی لیے دنیا بھر میں عورتیں نہ صرف قدامت پرست ہیں بلکہ ان سے تقاضا کیا جاتا ہے قدامت پرستی کا اور یہ ٹھیک ہے۔ انہیں کبھی اپنے آپ کو ایسے مرد کے حوالے نہیں کرنا چاہیے جو اس کی اور اس کے بچوں کی ذمہ داری قبول نہ کرے۔"

بیدی کا یہ یقین جسے وہ خود حقیقت کہہ چکے ہیں اتنا پختہ ہے کہ وہ عورت کو جو ایسے حالات میں آجائے جہاں مرد اس کے بچے کی ذمہ داری قبول نہ کر سکے تو بھکارن اور طوائف کے علاوہ کسی اور روپ میں نہیں دیکھ

سکتے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ دوبارہ کسی ایسے مرد کی بیوی بن جائے جو اس کی اور اس کے بچوں کی ذمہ داری قبول کرلے۔ بیدی کا ناول ''ایک چادر میلی سی'' میں بھی بنیادی سچائی یہی ہے جب رانو اپنے دیور منگل کو جس سے اس کی زبردستی شادی کردی گئی ہے جسمانی طور پر قبول کرتی ہے تو اس کے سامنے صرف اس کے بچوں کی ضروریات ہوتی ہیں۔

رانو نے اور آگے ہوکر منگل کے اریب کرتے کا دامن تھام لیا اور بولی ''تم آج پھر پسرور نہیں تو گجرانوالے، نہیں سیالکوٹ، ہمبر ٹال کی سواریاں ڈھونڈ لینا بچے بھی قمیص مانگتے ہیں۔''

منگل جیسے ایک دم فرمائشوں کے شیریں اور ترش انبار کے نیچے دب گیا۔ ساز میں سے کلغی نیچے گر گئی جسے اُٹھاتے، پھر سے ساز میں ٹکاتے ہوئے اس نے رانی کی طرف دیکھا جو ابھی تک اس کا کرتا تھامے ہوئے تھی جیسے منگل اس کا چور تھا جیسے رانو کا کوئی قرض تھا جسے منگل کو چکانا تھا۔

''اچھا بابا اچھا'' منگل نے اپنا کرتا چھڑایا اور چل دیا رانی السائی سی کھڑی، چوکھٹ میں جڑی ہمیشہ کی طرح اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اس کا مرد تکمیل، وتعمیل کی ایک رات اور آدھے ہی دن نے جس کی عمر میں دنوں، مہینوں اور برسوں کا اضافہ کردیا پھر رانی اسے دیکھ کر ایکا ایکی ٹھٹھک گئی۔ تکو کا! نہیں منگل۔

بیدی اپنے اس روّیے میں عورت کے ہمدرد تو ہیں مگر مختلف نہیں ہیں۔ صدیوں سے ہماری مذہبی اور دیومالائی کتابوں نے عورت کے لیے ایک ہی کردار متعین کیا ہے جس میں وہ مرد سے کمتر ہے کیونکہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہے جذباتی طور پر زیادہ حساس ہے اور معاشرتی دباؤ کو قبول نہیں کرسکتی۔ یہ مفروضے کہ عورت بزدل ہے ناقص العقل ہے مردانہ سماج کی دین ہیں، جس میں انہوں نے اپنی مرضی خیالات اور آسانیوں کے مطابق ایک عورت کا وجود فرض کرلیا ہے اور اسی عورت کو زندگی میں بھی اور تحریر میں بھی برت رہے ہیں۔ مرد آدمی ہے عورت کچھ اور ہے۔؟۔ کیا ہے؟ کوئی شے، شے سے بڑھ کر دیوی، فرشتہ، شیطان، کوئی چیز اس کا فیصلہ اس کے لیے مشکل ہے کیونکہ اس نے تو اس مکمل انسان کو دیکھا ہی نہیں ہے جو فکر، شعور، ادراک اور احساسات میں اس کی ہم پلہ ہے۔

صدیوں سے رائج ان رسوم رواج کے پردے میں عورت کو معاشرتی زندگی سے اس طرح الگ کردیا گیا کہ مکمل عورت اپنی ذہانت اور توانائیوں کے ساتھ سامنے آ ہی نہ سکے محکوم بیوی، داشتہ، طوائف، بھکارن یہ وہ کردار ہیں جنہیں افسانہ نگار اپنی اپنی بساط، تخیل یا اساطیر کے حوالوں سے لکھتے رہے ہیں جبھی بیدی کا افسانہ ''گرہن'' بہت بڑا ہوتے ہوئے بھی اپنے اختتام پر اسی محدود دائرے میں آجاتا ہے کہ عورت کی عزت، عصمت صرف گھر کی چہار دیواری میں محفوظ ہے وہ اس سے نکلتی ہے تو تارتار ہوجاتی ہے۔

بیدی نے اپنی کہانیوں میں ہندو فلسفے اور اور مائتھالوجی کا تخلیقی استعمال کیا ہے اس کے حوالے جگہ جگہ نظر

آتے ہیں ہندو مائتھالوجی پرش میں اور پراکرتی برہمہ یا ایشور کے دو مظاہر ہیں ان میں جو پرش ہے وہ رہنما، علمبردار ابدی پراکرتی سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ بھگوان ہے اور ہر اعتبار سے عظیم و برتر ہے جب کہ پراکرتی جمال اور تخلیق کا مظہر ہے، ابدی بنی ہر چیز اس سے پیدا ہوتی ہے اور اسی میں سما جاتی ہے اس طرح پراکرتی سے جو کچھ تخلیق ہوتا ہے وہ پرش کا مرہونِ منت ہے۔ یہی الوہی تصور ہندوستان کے سماج میں عام زندگی میں مرد اور عورت کی شکل اختیار کر گیا ہے مرد کو تو نام ہی پرش دیا گیا ہے جب کہ پراکرتی کی ساری خصوصیات جن میں جمال جنم سپردگی ہے عورت کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔ چنانچہ متھ کے زیر اثر عورت کو تکمیل کے لیے مرد کی پرستش کرنی چاہیے اور تکمیل یہ ہے کہ وہ اپنا تولیدی عمل اس کی مرضی کے مطابق انجام دے۔ اگر وہ اپنے اس ڈھلے ڈھلائے مقدر سے روگردانی کرتی ہے تو نابود ہو جاتی ہے۔ اس کا مقدر متعین ہے۔ بیدی کی کہانی گربن میں ہولی جب اپنے شوہر کا گھر چھوڑتی ہے تو نحوست کے سارے اثرات اس پر ظاہر ہو نے لگتے ہیں۔ وہ کہیں محفوظ نہیں ہوتی۔ اپنے میکے میں ساتھ کھیلے ہوئے ہم جولی سے بھی نہیں۔

ہمارے معاشرے میں عورت کے لیے پناہ گاہیں بنانے پر زور دیا گیا ہے خود اسے مضبوط بنانے پر توجہ نہیں دی گئی۔ یہ پناہ گاہیں اس کے باپ کا گھر، شوہر کا گھر اور بیٹے کا گھر ہے، اس کا اپنا گھر کہیں نہیں جہاں وہ اپنی مرضی اور اپنی انا کے ساتھ رہ سکے۔ اپنی مرضی کی نیند سو سکے، لباس پہن سکے اور کھانا کھا سکے۔ صدیوں سے بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھنے اور پردے اور دیواروں میں قید کرنے کو اس کے تحفظ کا نام دینے پر کتابوں کے اوراق سیاہ کیے گئے ہیں۔ ان کے اثرات ادب پر بھی واضح ہیں خواہ شعوری ہو یا لاشعوری ادیبوں نے عورت کو کہیں فرشتہ لکھا ہے تو کہیں شیطان، انہیں اس کے جسم کے علاوہ ذہن کہیں نظر نہیں آتا یہی وجہ ہے جس کی بناء پر فیمنسٹ نقاد کہتی ہیں کہ ہم وہ نہیں جو آپ نے سمجھا ہے اور لکھا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ سمجھا گیا ہے اس میں لکھنے والے کا تجربہ اور تخیل کس حد تک شامل ہے۔ کہانی اساطیر سے نکل کر جدید افسانوں تک آتے آتے ماورایت و تخیل سے زیادہ زمینی حقیقتوں کے قریب آ گئی ہے وہ ایسی تخلیق کا تقاضا کرتی ہے جس میں کردار مصنوعی نہ ہوں اور واقعات کا تسلسل سچائی سے قریب ہو، تاہم وہ آرٹ کا حصہ بھی بن سکے۔ قمر جمیل نے لکھا ہے ”کہانی کا آرٹ تخیلاتی روپ سے زیادہ زمینی روپ میں ظہور کا تقاضہ کرتا ہے اور کرداروں کے باہمی رشتوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ حقیقت کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور انسانی وجود کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جن کا تعلق انسانی رشتوں کے علاوہ انسانی تقدیر سے بھی ہوتا ہے“ (جدید ادب کی سرحدیں صفحہ 246)۔ قمر جمیل نے انسانی تقدیر کا حوالہ دے کر مطالعہ کے ایسے پہلو کی نشاندہی کی ہے جو باریک بینی چاہتا ہے اگر کسی کہانی نگار نے کردار کی تقدیر کو پہلے سے متعین کر لیا ہو تو کیا واقعات کے تسلسل میں وہ متعین تقدیر پر حائل ہوگی۔ یہ سوال اس لیے بھی میرے ذہن میں آیا ہے کہ بیدی نے بہت خوبصورتی سے ایسے

ہی ایک سچویشن کے گرد کہانی بنی ہے جس میں شوہر زندہ دل بیوی جیت کے بارے میں رمال کی پیش گوئی سنتا ہے کہ وہ زیادہ دن نہیں جیے گی اور پھر اس کا تخیل کہانی کو جنم دیتا ہے۔ جس میں ایک دوسری عورت، اس کی بیوی ہے جس میں وہ سب خصوصیات دیکھ رہا ہے، جو پہلی میں نہیں۔

بیدی کہانی اور کرداروں پر بہت محنت کرتے ہیں، انہوں نے اس بات کو تسلیم بھی کیا ہے۔ منٹو نے ان پر اعتراض کیا تھا کہ وہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہیں وہ جزیات پر بہت زور دیتے ہیں مگر ان جزیات میں ایسے جملے بھی ہوتے ہیں، جنہیں پڑھتے ہوئے خیال آتا ہے کہ اس کی کہانی کو کیا ضرورت تھی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ متعدد بار ایسے جملے عورت سے متعلق ہوتے ہیں اور تبصرے کی صورت میں سامنے آتے ہیں کہانی کو کرداروں کے عمل سے بڑھانے کے بجائے تبصرے سے بڑھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا، تاہم بیدی کے یہ تبصرے چونکہ کرداروں کی زبانی ہوتے ہیں اس لیے مصنف کا تبصرہ نہیں بنتے مگر اکثر جگہوں پر غیر متعلق سے لگتے ہیں اور کہانی کی بے ساختگی میں حائل ہو جاتے ہیں ایسے چند تبصرے دیکھیں۔

۱۔ ''جیسے رسوم و روایات میں بندھی ہوئی کنواری چاہتی ہے کہ سوتے میں کوئی اس سے لپٹ جائے تا کہ اس کا کوئی قصور نہ ہو اور...... (مہاجر)''

۲۔ ''عورت نام ہے خرچ ہونے کا'' گھٹنے کا اور بڑھنے کا'' مناسب وقت کے بعد خاک اور خون میں لت پت ہونے کا ورنہ وہ عورت ہی نہیں رہتی لیونارڈو کا شاہکار ہو کر رہ جاتی ہے۔'' (سونفیا)

۳۔ ''کلیان کے پاس ایک پھٹیچر سی گاڑی تھی جس کی بیڑی ادھیڑ عمر کی عورت کی طرح بات بات پر ناراض ہو جاتی تھی اور بعض وقت تو کوئی بات بھی نہ ہوتی تھی اور یہ ڈاؤن ایک عجیب طرح کی کلامیٹرک کا دور آیا تھا جس میں اس کا حیض سب ختم ہو چکا تھا اور وہ بے حد چڑ چڑی ہو رہی تھی۔''

یہ چند جملے ہیں جن کے نہ لکھے جانے پر بھی کہانی پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ لیکن ان سے اس ذہنی روّیے کا پورا پتہ چل رہا ہے جو ہمارے معاشرے میں عورت کے لیے روا ہے۔ بیدی نے اسے لکھ دیا ہے ورنہ غیر ضروری طور پر اور بلا وجہ عورت پر تضحیک آمیز تبصرے کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

بیدی کی خوبی یہ ہے کہ وہ سماج کے اس روّیے کا ادراک رکھتے اور اس راکھ کو کرید دیتے ہیں، جس کو معاشرے نے دبائے رکھا ہے۔ وہ چنگاری جو اندر ہی اندر سلگ رہی ہے اس کی تپش عورت کے وجود کو جھلسا رہی ہے گر اس آگ پر پانی ڈالنے کے بجائے اسے یونہی جلتے رہنے پر زور دیا جاتا ہے۔ بیدی تک یہ تپش پہنچ رہی ہے وہ سوچنے والا ذہن اور حساس دل رکھتے ہیں مگر وہی ذہن و دل جو ہندوستانی سماج کے زیر اثر ہے جس پر صدیوں کی روایات اور دیومالا کی چھاپ گہری ہے وہ کہتے ہیں۔

''اور جس بات کو میں جھوٹ سمجھتا ہوں فادر روزراریو! اسے میں سچ جھوٹ کہتا ہوں وغیرہ وغیرہ، کیونکہ

کوئی چیز ثابت وسالم نہیں اور نہ اکائی کی حیثیت رکھتی ہے، سوائے اس خدا یا سوا سو عناصر کے جو مرکب ہونے کے لیے تڑپتے رہتے ہیں۔ سونا ان میں سے ایک ہے، مگر اس کی حیثیت بھی اس وقت بنتی ہے جب وہ میری معشوقہ کے گلے کی زینت ہو۔ اگر اکائی ہی سب کچھ ہوتی باپ روز اریو! تو پرماتما، جو پرش ہے، مرنے سے اکیلا رہتا۔ کیوں اس نے اپنے لیے پرکرتی پیدا کرلی؟ کیوں ہر چیز کو نامکمل رکھا اور مرکب ہو جانے پر مجبور کر دیا؟ کیا اس لیے کہ موت میں بکھر جانے کا فن سیکھے؟ واہ کیا فن ہے! وہ جذبہ جوڑ کو دیا اس کا کچھ حصہ مادّہ کو بھی کیوں دے دیا؟ میں بتاتا ہوں، کیوں؟ اس لیے کہ ہر چیز تکمیل کے لیے تڑپتی رہے اور اچھی اچھی کہانیاں پیدا ہوں، شعر کہے جائیں، تصویریں بنیں اور تانیں اڑیں۔"

وہ اپنی کہانیوں کا جواز اس یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس کی بنیاد متھ پر ہے اور وہ متھ (Myth) جہاں عورت مکمل وجود نہیں بلکہ نر کا ایک حصہ ہے۔ تصوراتی یقین ہمارے پورے معاشرے کی اقدار و روایات میں بسا ہوا ہے۔ آج خواتین اس کی بنیادوں کو چیلنج کر رہی ہیں اور ان تحریروں کی اصل حیثیت کو سامنے لا رہی ہیں جنھیں بڑے وثوق سے شاہکار کہا جاتا ہے۔

Address:
Director, Public Relation
SESSI, Gulshan-e-Iqbal, Karachi.

نجم الدین احمد

نثری نظم

نثری نظم کے حق اور ردّیت میں بے شمار مضامین اب تک رقم کیے جا چکے ہیں۔ نثری نظم کی مخالفت میں ہمیشہ بلا دلائل و مناسب حوالہ جات کے شدت برتی گئی ہے۔ ہم اس کے قائل ہیں کہ نثری نظم کی مخالفت کی جائے اور ضرور کی جائے۔ مگر دلائل کے ساتھ، حوالہ جات کے ساتھ۔ الزام برائے الزام اور تنقید برائے تنقید کی بجائے برائے اصلاح ہوں تو بہتر ہیں۔ نثری نظم کو رد نہ کیجیے اسے اُردو ادب سے خارج کرنے کے لیے تاریخی حوالہ جات اور مناسب دلائل تو لائیے۔ آیئے، پہلے ہم نثری نظم اور نثری نظم گو شعراء پر آج تک عاید کیے گئے الزامات، اور پھر علی الترتیب ان کا جواب تاریخی حوالہ جات اور معقول دلائل کے ساتھ، الزامات عاید کرنے والوں کے برعکس، ادبی اور معتدل زبان میں دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۔ نظم تسلسل کو کہتے ہیں۔ ایک مخصوص انداز اور کیفیت کے ساتھ اس کا وجود خیال کی اکائی بنتا ہے۔ اگر اس نظریئے کو سامنے رکھا جائے تو نثری نظم کی اصطلاح اپنا مفہوم کھو بیٹھتی ہے۔

۲۔ ایک سوال بار بار ذہن میں آتا ہے کہ نثری نظم، نظم ہے یا نہیں؟ یہ نئی ہے تو صرف فارم کی حد تک۔ فارم کی تبدیلی اپنی حد تک نئی ہے۔ لیکن فارم تو صرف ذریعۂ اظہار ہے، اصل مقصد نہیں۔

۳۔ ادب میں حقیقی تبدیلی اس وقت آتی ہے جب زندگی اور اس کے نظریوں میں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ سوچنے کا انداز بدلتا ہے۔ زندگی کی اقدار متاثر ہوتی ہیں۔ معاشرے میں تبدیلی آتی ہے۔ معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل روپ بدلتے ہیں۔

۴۔ نثری نظم کا مطالعہ اس امر کا شاہد ہے کہ یہ تحریک کسی ضد کا نتیجہ تھی۔ اسے ہم نثری نظم کے تخلیقی کارناموں کی روشنی میں ذہنی دیوالیہ پن بھی قرار دے سکتے ہیں۔

۵۔ آسیب زدگی، محرومی کا شدید احساس، جنسی ناآسودگی، ابہام، نفسیاتی اُلجھنوں کے صرف تاریک پہلو، مایوسی کے بھیانک تصوّرات، جدت اور انفرادیت کی کوشش، ناکامی اور نامرادی سے پیدا ہونے والا منفی جذبہ، الفاظ کے خود ساختہ مفہوم اور زندگی کو محض ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے کی عادت، نثری نظم کی خصوصیات بن کے رہ گئی ہیں۔ یہ سب کچھ آسیب زدہ ذہنیت کے تحت ہوتا ہے۔

۶۔ ان (نثری نظم گو شعراء) کی نظموں میں لایعنی فلسفہ، ابہام، جنسی انارکی، خیالات کو مزید اُلجھن کے ساتھ منفی انداز میں پیش کر کے ایک نئے انقلاب کی نوید سنائی جاتی ہے۔ بات ادھوری کہنا، نرمائشی قہقہہ لگانا اور

خودنمائی اُصولوں پہ اپنی تخلیق کی بنیاد رکھتے ہیں۔ نثری نظم گو کو اس بات پر اصرار ہے کہ قاری اس کے ذہن کی گتھیوں اور شعور و لاشعور کی جنگ کو کسی کشف و کرامات کے ذریعے معلوم کرے۔ الفاظ کو جو مخصوص مفہوم انہوں نے دیے ہیں وہ خالص ان کے ذہن کی اختراع ہیں۔ نثری نظم گو کو یہ غلط فہمی بھی ہے کہ وہ اپنے دور کے سقراط بقراط ہیں۔

۷۔ نثری نظم گو شعراء بھی، انگریزی پروز پوئم شعراء کی طرح، اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ نارمل بات کو ابنارمل بنا کر کہا جائے۔ جب تک اسے عجوبہ نہیں بنایا جائے گا پڑھنے والے کے کان کس طرح کھڑے ہوں گے۔ جب قاری اس چیستان میں الجھ جاتا ہے تو وہ خود نئی نئی تاویلیں گھڑنے لگتا ہے۔ اس طرح جو کچھ بھی لکھا جائے گا اس کی حیثیت اُلجھی ہوئی علامتوں تک محدود رہے گی۔

۸۔ نثری نظم میں وہ لوگ زیادہ آئے جو شاعری سے عاری تھے، جو صرف جدت پسندوں میں اپنا نام درج کروانا چاہتے تھے اور شاعری کو بھی محض فیشن تصور کرتے تھے۔

۹۔ آج کل جو نثری نظمیں آ رہی ہیں اس میں اس بات کا خصوصی اہتمام ہے کہ شعر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگے پیچھے ملاتے رہیں۔ اینٹوں کے چننے میں بھی ایک حسن ہوتا ہے۔ نثری نظم کے شاعر کی یہ چڑ ہے۔ ایسی حالت میں کہیں کوئی ایسی ترتیب آ بھی جاتی ہے تو وہ اسے ایک بڑی خامی سمجھ کر بے ترتیب کر دیتا ہے لیکن اس بات پر بضد ہے کہ اس کی تخلیق کو نظم کہا جائے۔ یہ نظمیں مفہوم کے لحاظ سے اس لیے بھی مختلف ہو جاتی ہیں کہ دو متضاد چیزیں یکساں نہیں ہوتیں، اس لیے اس کے مفہوم کو ہر بار نیا رنگ دیا جاتا ہے، جو بیزاری کا سبب بن جاتا ہے۔

اعتراضات نمبر ۵ تا ۹ میں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ بات طعن و تشنیع سے دشنام طرازی کا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ دشنام طرازی ادیب اور نقاد کو زیب نہیں دیتی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے تنقید برائے اصلاح ہو تو بہتر اور برائے تنقید ہو تو بدتر ہوتی ہے۔ آیئے، اب ان الزامات کا باری باری جواب دیتے ہیں۔

۱۔ پہلا اعتراض ابہام کے دو متضاد پہلو لیے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے کہ معترضین خود **confusion** کا شکار ہیں کہ در حقیقت وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ ایک پہلو میں نثری نظم کو نظم ماننے سے انکار کیا ہے مگر دوسری طرف ''اصطلاح'' کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ نظم تو تسلیم کر لیا ہے مگر اصل اعتراض نام پر ہے۔

جہاں تک اس صنفِ سخن کو سرے سے صنفِ سخن تسلیم نہ کرنے کی بات ہے تو سب سے پہلے یہ کہ معترضین نے خود اپنی بیان کردہ تعریف ہی میں اسے نظم تسلیم کیا ہے۔ ''نظم تسلسل کو کہتے ہیں۔ ایک مخصوص انداز اور کیفیت کے ساتھ اس کا وجود خیال کی اکائی بنتا ہے۔''

نثری نظم میں مخصوص انداز اور کیفیت کے ساتھ خیال کی اکائی موجود ہوتی ہے۔ نظم کے لیے دو شرائط ضروری

ہوتی ہیں۔ اوّل وحدت (Unity) اور دوم کلیت (Totality) یعنی مسلسل، مربوط اور مکمل خیال پر مبنی شاعری کو نظم کہتے ہیں۔ ہیئت اوزان، بحور و قوافی سے آزاد ہو کر بھی ایک جسم رکھتی ہے اور نثری نظم کے جسم کی رُوح وحدتِ خیال ہے۔ غزل اوزان، بحور و قوافی کی پابندی کے باوجود انہی دو شرائط کی بناء پر نظم نہیں کہلاتی۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل مضمون اور علیحدہ خیال کا حامل ہوتا ہے۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ غزل میں بہ اعتبارِ ہیئت متعدد بہ تجربات ہوئے مگر سب کے سب ناکامی سے دوچار ہوئے جب کہ نظم میں ہونے والے تجربات نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ ان تجربات نے نظم کو نئی نئی اقسام سے بھی روشنا کروایا جیسے معریٰ نظم (غیر مقفیٰ نظم)، آزاد نظم اور نثری نظم وغیرہ۔

ازمنۂ قدیم سے یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ شاعری نثر میں بھی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم یونان میں ڈراموں کو شاعری سمجھا جاتا تھا۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کو بھی شاعری قرار دیا گیا ہے۔ اس بارے میں مختلف دانشوروں کی رائے ملاحظہ کیجیے:

''وزن یا موزونیت شاعری کے لیے لازمی نہیں۔'' ۲ ارسطو

''اوزان و بحور کو میں شاعری میں اوپر سے ٹھونس دی گئی اشیاء سمجھتا ہوں۔'' ۳ (ورڈزورتھ)

''وزن کے بغیر بھی عظیم ترین شاعری ممکن ہے۔'' ۴ (کولرج)

''شعر کے لیے وزن ایک ایسی چیز ہے جیسے راگ کے لیے بول، جس طرح راگ فی حد ذاتہٖ الفاظ کا محتاج نہیں، اسی طرح شعر وزن کا محتاج نہیں ...... وزن اور قافیہ جن پر ہماری موجودہ شاعری کا دارومدار ہے اور جن کے بغیر اس میں کوئی خصوصیت ایسی نہیں پائی جاتی جس کے سبب سے شعر پر شعر کا اطلاق کیا جاسکے، یہ دونوں شعر کی ماہیئت سے خارج ہیں۔'' ۵ (الطاف حسین حالیؔ)

الطاف حسین حالیؔ اپنے اس بیان کے حق میں دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قدیم عرب کے لوگ یقیناً شعر کے یہی معنی سمجھتے تھے۔ جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھ کر کوئی مؤثر اور دلکش تقریر کرتا تھا، اسی کو شاعر جانتے تھے ...... یہی سبب تھا کہ جب قریش نے قرآنِ مجید کی نرالی اور عجیب عبارت سنی تو جنھوں نے اس کو کلامِ الٰہی نہ مانا وہ ''عام لوگوں کے نزدیک ...... وزن ہے۔ اس لیے عام لوگ کلامِ موزوں کو شعر کہتے ہیں، لیکن محققین کی یہ رائے نہیں ...... ان کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں۔'' ۷

(مولانا شبلی نعمانی)

مندرجہ بالا رائے سے ثابت ہوتا ہے کہ اوزان و بحور کے بغیر بھی شاعری ہو سکتی ہے یعنی نثر میں شاعری یعنی نثری نظم۔ ہیئت میں اوزان و بحور نہ ہوں تب بھی یہ ایک جسم کی مانند ہے اور جسم بے رُوح نہیں ہو سکتا۔ نثری نظم کی رُوح وحدتِ خیال ہے۔ دوسری طرف ایسی منظومات شاعری کہلانے کی مطلق حقدار نہیں ہیں جن میں اوزان،

بحور اور قوافی کی پابندی تو ہو مگر محض الفاظ کا ڈھیر جیسے غالب کا بچوں کو فارسی کی تعلیم دینے کے لیے مرتب کیا گیا ''قادر نامہ'' اور مولانا الطاف حسین حالی کی ''مسدس مدو جزر اسلام'' کے اشعار، جن کے بارے میں کلیم الدین احمد نے لکھا ہے:

''ان خیالات کا بیان نثر میں بھی ممکن تھا۔ حالی انہیں لباسِ وزن سے آراستہ کرتے ہیں لیکن وزن کی موجودگی شعریت کی دلیل نہیں۔'' ۸

حالی ہی کی بعض منظومات کے بارے میں ناقدین کی بھی یہی رائے ہے کہ وہ اوزان و بحور ہونے کے باوجود شاعری کے زمرے میں آنے کے قابل نہیں ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ''نہر پر چل رہی ہے پن چکی'' اور ''کوے ہیں سب پیارے پیارے'' بھی پابند ہونے کے باوجود شعریت کے حسن سے عاری ہیں۔ اگر صرف اوزان و بحور اور قوافی ہی شاعری کا پیمانہ ہیں تو پھر خارج و معروضی آہنگ کی حامل ٹریفک پولیس کی تنبیہات کو بھی شاعری تسلیم کرنا پڑے گا۔

اسی طرح محکمہ بہبود آبادی کا نعرہ ''بچے دو ہی اچھے'' بھی شاعری قرار پائے گا اور درج ذیل جیسے بے شمار اشعار کو بھی شاعری تسلیم کرنے میں عار محسوس نہیں کرنا چاہیے گو کہ منظوم ہونے کے باوجود انہیں شاعری نہیں کہا جا سکتا۔

درحقیقت شاعری اوزان و بحور و قوافی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ افلاطون شاعری کو نقل قرار دیتا ہے جس سے مسرت اخذ کی جاتی ہے۔ شاعری کا اصل وہ خیال ہے جو شاعر کے ذہن میں آتا ہے اور اسی خیال کی نقل کو کاغذ پر شاعر، شاعری کا پیرہن زیب تن کرا کے تحریر کرتا ہے۔ ورڈز ورتھ کے نزدیک شاعری شدید جذبات کا شدید اظہار ہے۔ کولرج تخیل کی مسرت انگیز کارفرمائی کو شاعری سمجھتا ہے جب کہ میتھیو آرنلڈ نے تہذیبی حوالوں سے بات کی ہے۔ ۹

جہاں تک نام پر اعتراض کا تعلق ہے تو یہ اعتراض پہلی بار نہیں کیا گیا۔ نثری نظم اُردو میں فرانسیسی ادب سے انگیزی کے واسطے سے وارد ہوئی ہے۔ اس کا تذکرہ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں ہندوستان میں ہونے لگا تھا اور ۱۹۶۰ء کی دھائی میں یہ صنف اپنی باقاعدہ شناخت بنانے میں کامیاب ہوئی۔ تب سے اس کے نام کا مسئلہ درپیش ہے۔ نثری نظم کو ماضی میں کئی نام دیے گئے مثلاً نثرِ لطیف، نثم، غیر معروضی شاعری، غیر عروضی نظم۔ ناقدین کی اکثریت اس صنفِ سخن کو انگریزی کی پروز پوئم کا نعم البدل سمجھتی ہے۔ اس لحاظ سے ''نثری نظم'' قریب ترین صورت بنتی ہے۔ اسے نثری نظم کہیں یا نثم یا کچھ اور، یہ شاعری ہے اور رہے گی۔ نظم کی تعریف کے مطابق نثری نظم خیال اور مضمون کی وحدت و کلیت کی حامل ہوتی ہے لہٰذا تناقض کے باوجود نام قابلِ قبول ہو جاتا ہے۔

۲۔ معترضین کے ذہن میں بار بار خیال آتا ہے کہ نثری نظم، نظم ہے بھی یا نہیں؟ مگر وہ قاری کی دلچسپی و تسلی کی خاطر اس کا جواب دیے بغیر ہی نئی بات چھیڑ دیتے ہیں، نثری نظم کی فارم یا ہیئت کچھ۔ لیکن ہم نے اوپر اس

سوال کا تسلی بخش انداز میں مناسب حوالہ جات و دلائل کے ساتھ جواب دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

فارم اگر صرف ذریعۂ اظہار ہے اصل مقصد نہیں تو اصل مقصد کیا ہے؟ کیا الفاظ ذریعۂ اظہار نہیں ہیں؟ اور الفاظ سے بننے جانے والے اشعار کی پھر کیا حقیقت ٹھہرتی ہے؟ اصل مقصد ہی اظہار کی قوت ہے۔ جانور الفاظ ادا کرنا نہیں جانتے کیونکہ ان کے پاس اظہار کی یہ قوت نہیں ہے۔

"شاعری میں وجدان کا اظہار الفاظ کے واسطے سے کیا جاتا ہے۔" ۱۰ (نیو بولٹ)

شاعری انسان کے ان جذبات کا اظہار ہے جن میں وہ شدت محسوس کرتے ہوئے اپنی جبلت اور زندگی کی طرف رویوں کا اظہار الفاظ کے وسیلے سے کر کے مسرت محسوس کرتا ہے۔ ایسی مسرت جو اس پر وارفتگی کی کیفیت طاری کردے۔ "ترفع" اسی صورت کا دوسرا نام ہے۔ شاعری نہ صرف باطنی سطح پر بلکہ جمالیاتی سطح پر بھی کشش رکھتی ہے جس کے لیے اوزان، بحور اور قوافی کی پابندی ضروری نہیں۔ لہٰذا نثر و شاعری ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ معاون ہیں۔

شاعری مشروط ہے آہنگ (Rythm) سے۔ آہنگ نام ہے آوازوں کے سلسلے، ان کے درمیان وقفوں کی تکرار اور مد و جزر کا، جو سننے والے کے ذوق اور وجدان پر اثر انداز ہوتے ہوئے روحانی اور جذباتی آرزو کی تکمیل کا باعث بنتا ہے۔ ہر زبان کا ہر حرف مخصوص آہنگ کا حامل ہوتا ہے اور ہر لفظ مختلف آہنگوں کا منفرد مجموعہ۔ آہنگ کی دو قسمیں ہیں، خارجی یا معروضی آہنگ اور داخلی یا لسانی آہنگ۔ خارجی آہنگ کو اوزان و بحور کے تحت معروضی طور پر محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ تقطیع کے ذریعے بہ آسانی شناخت کیا جاسکتا ہے جب کہ داخلی یا لسانی آہنگ کی معین صورت نہ ہونے کی بناء پر اس کی تقطیع ممکن نہیں۔ پابند شاعری میں دونوں آہنگ موجود ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس نثری نظم محض داخلی یا لسانی آہنگ کی حامل ہوتی ہے۔

"آہنگ داخلی ہو یا خارجی ان کا امتزاج، بذاتِ خود شعر نہیں، زیادہ سے زیادہ اسے شعری وصف کہہ سکتے ہیں۔ وہ حتمی اور لازمی نہیں۔" ۱۱

مختصراً یہ کہ خارجی آہنگ کی غیر موجودگی اور محض داخلی آہنگ کی موجودگی میں نثری نظم بہترین ذریعۂ اظہار ہے جو بذاتِ خود پابند شاعری کی طرح ایک عظیم مقصد ہے۔

۳۔ یہ اعتراض ہر ذی شعور قاری کو فضول لگا ہوگا۔ یہاں پر یہ سوالات ہی اس اعتراض کا جواب ہیں کہ کیا آج بھی زندگی اسی قدر سادہ ہے اور اس کا وہی نظریہ اور نقطۂ نظر ہے جو ولی دکنی یا غالبؔ یا اقبالؔ یا ناصرؔ کاظمی، مجیدؔ امجد اور فیضؔ کے ادوار میں تھا؟ کیا سوچ میں تغیر پیدا نہیں ہوا؟ کیا زندگی کی طرف رویہ اور اس کی اقدار نہیں بدلیں؟ کیا معاشرے میں اور معاشرتی رجحانات میں تبدیلیاں وقوع پذیر نہیں ہوئیں؟ معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل نے روپ نہیں بدلا؟ بہت زیادہ پیچھے کیوں جایئے صرف چند سال قبل کے نائن الیون

(9/11) اور مابعد سیون سیون (۷/۷) کے واقعات یا حادثات ہی نے زندگی کے ہر روّیے، ہر نہج، ہر انداز اور ہر بات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ پھر ادب میں تبدیلی آنا چاہیے اور اگر ایسا نثری نظم کے ذریعے سے ہو رہا ہے تو قابلِ اعتراض بات کیا ہے؟

۴۔ نثری نظم نہ تو کسی ضد کا نتیجہ ہے اور نہ ہی ذہنی دیوالیہ پن کی بناء پر اس کا ظہور ہوا ہے۔ نثری نظم کو ضد یا ذہنی دیوالیہ پن کا نتیجہ قرار دینا اعتراض سے زیادہ بہتان دکھائی دیتا ہے۔

مُقفّیٰ نظموں کے بعد جب پہلے پہل غیر مقفّیٰ نظم، جسے بعد میں معریٰ نظم کا نام دیا گیا، کا تجربہ کیا گیا اور پھر جب آزاد نظم (Varsan Libra) فرانسیسی ادب سے انگریزی صنف Free Verse کے ذریعے اُردو ادب میں آئی، تب بھی ان کے مخالفین ہوئے مگر یہ اصناف مقبول ہوتی چلی گئیں اور آج بالاتفاق قبول ہیں۔ اسی طرح آنے والے وقت میں کسی اور نئی صنف کے تجربے پر جھگڑا کھڑا ہوگا اور نثری نظم اُردو ادب میں قبولیت کی سند حاصل کر چکی ہوگی۔

''روایت پرست معاشرہ ہمیشہ نئے تجربات سے خوفزدہ رہتا ہے اس لیے کہ ہر بار نیا تجربہ اس کی مزید شکست وریخت کر دیتا ہے۔'' ۱۲ (تبسم کاشمیری)

''یہ شاعری کسی لبریشن کی ایک کوشش ہے۔ یہ ایک اسلوبِ شعر سے دوسرے کی طرف جانے کا سفر ہے۔'' ۱۳ (اصغر ندیم سیّد)

مندرجہ بالا آراء سے ثابت ہوتا ہے کہ نثری نظم کسی ضد یا ذہنی دیوالیہ پن کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک تجربہ ہے، ویسا ہی جیسا اس سے قبل معریٰ اور آزاد نظموں کی شکل میں ہو چکا ہے۔

(۵، ۶، ۷) یہ اعتراضات محض الزام تراشیوں اور بہتانوں پر مشتمل ہیں۔ ایک ہی بات کو بار بار الفاظ بدل کر بیان کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ زور جنسی انارکی اور نارمل بات کو ابنارمل بنا کر کہنے پر دیا گیا ہے۔ جہاں تک، جنسی انارکی کا تعلق ہے تو آپ شاعری کی لطیف ترین صنف غزل کے استاد شعراء سے لے کر آج تک مطالعہ کر لیجیے۔ آپ کو جنسی بے راہ روی سے بھرپور اتنے اشعار مل جائیں گے کہ کئی دیوان بنائے جا سکتے ہیں۔ ایسے اشعار میں مرد وزن کے باہمی نازک افعال کو بھی کھول کھول کر اور مزے لے لے کر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں پر اشعار دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے، کیا ایسے اشعار کی بناء پر غزل کو بطور صنف ادب سے ہی خارج کر دیا جائے؟ جواب یقیناً نفی میں ہے۔ اگر کچھ شعراء نے کچھ ایسی ہی نثری نظمیں کہی بھی ہیں تو اس میں نثری نظم کا کیا قصور ہے؟

رہا معاملہ اعتراض کے دوسرے حصے کا تو نثری نظم میں بھی پابند نظم کی طرح علامات، تشبیہات اور استعارات استعمال ہوتے ہیں جو تخیل کو تحریک دینے اور خوبصورت امیجز (Images) پیدا کر کے مسرت کا باعث

بنتے ہیں۔ یہ نظمیں جوہر کی حامل اور جمالیاتی خصائص سے بھرپور ہوتی ہیں۔ گویا ان میں، جملہ شعری اوصاف موجود ہوتے ہیں جن کے استعمال سے شاعر اپنے تخلیقی تجربے کا اظہار کرتا ہے۔ اوپر کے صفحات میں ہم اس پر سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔

۸۔ اس اعتراض کے جواب میں صرف ن۔م۔راشد کا نام پیش کروں گا جنہوں نے "دایاں بازو" اور "پریڈ" کے نام سے دو نثری نظمیں کہی تھیں۔ زندگی مہلت دیتی تو شاید اور نظمیں بھی کہتے۔

۹۔ لیجیے، یہاں معترضین اپنے موقف (اعتراض نمبر ۸) سے خود ہی منکر ہو گئے ہیں۔ نثر گو شعراء کو شاعر تسلیم نہ کرنے والوں نے "اینٹوں کے چننے میں بھی ایک حسن ہوتا ہے۔ نثری نظم نے شاعری کی یہ چیز ہے۔ ایسی حالت میں کہیں کوئی ایسی ترتیب آ بھی جاتی ہے تو وہ اسے ایک بڑی خامی سمجھ کر بے ترتیب کر دیتا ہے۔۔۔۔"

کہہ کر خود ہی شاعری سے عاری شعراء کو شاعر تسلیم کر لیا ہے۔ ظاہر ہے بے ترتیب وہی کر سکے گا جسے ترتیب کا ادراک ہوگا اور شاعری کی سمجھ۔

وحید قریشی کہتے ہیں:

"تجربہ ہونا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ پرانا عروضی نظام جاری رہے۔ آوازوں کے مختلف پچاس ہزار آہنگ ہو سکتے ہیں۔"

اس لیے ایران سے آمدہ عروضی آہنگ کو برقرار رکھنا لازمی نہیں ہے۔ ہندی شاعری میں تجربے ہوئے ہیں، انگریزی شاعری میں تجربے ہوئے ہیں۔ ان جدتوں پر اعتراض نہیں ہوا تو اب کون سی افتاد آ پڑی ہے۔۔۔۔ میرے خیال میں اس سے قطع نظر کہ کچھ برآمد ہوتا ہے یا نہیں تجربہ بہر حال ضرور ہونا چاہیے۔ اصل فیصلہ تو قاری نے کرنا ہے۔ اگر اس کے لیے تجربہ قابلِ قبول نہیں تو وہ خود رد کر دے گا۔ اگر نثری نظم والے کچھ دیتے ہیں تو کامیاب ہوں گے ورنہ خود فیل ہو جائیں گے۔" [۱۶]

ہمارا خیال ہے کہ نثری نظم دراصل ایک نئے اسلوب کی تشکیل کی کوشش ہے۔ اب تک ہونے والے تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ نثری نظم کا مستقبل روشن ہے۔ نثری نظم نگار ابھی تک ناکام نہیں ہوئے ہیں۔ تقریباً تمام رسائل و جرائد میں نثری نظمیں "نثری نظم" یا "نظم" کے عنوان سے شائع ہو رہی ہیں۔ لہٰذا مخالفت برائے مخالفت فضول امر ہے۔ وقت کو فیصلہ کرنے دیجیے۔ قاری پر اس کا بوجھ ڈال دیجیے۔

❀❀

Address:
259-61E Block Z,
BAHAWAL NAGAR : 62300
(Punjab)

ارمان نجمی

گیتوں کی زبان کے بارے میں معروضات

میں بحث کو طول دینا نہیں چاہتا تھا لیکن موضوع ایسا ہے کہ تفصیل کے بغیر بات نہیں بنتی ہے کہ بہت سا مواد ابھی ریکارڈ پر نہیں آسکا ہے۔ بھائی شمسی فاروقی یہ کہنے میں آزاد ہیں کہ ''سنسکرت برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے کتنے ہزار سال پہلے ختم ہو چکی تھی، اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔'' لیکن افسوس کہ سچائی یہی ہے۔ جس پر تمام ماہرین لسانیات متفق ہیں۔ میں نے جو کم از کم پندرہ سو سال کی بات لکھی تھی وہ میری ذہنی اختراع نہیں تھی۔ سنسکرت مردہ اس طرح ہو چکی تھی کہ وہ عوامی زبان کی حیثیت کھو چکی تھی صرف برہموں کے محدود حلقے میں اس کا چلن باقی رہ گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ سنسکرت ابھی پڑھائی جا رہی ہے۔ بلکہ لسانی اقلیتوں پر زبردستی لادی جا رہی ہے۔ چنانچہ میرے گھر کے بچے سنسکرت پڑھنے پر مجبور کیے جاتے ہیں (اور اُردو سے اس طرح دور کیے جا رہے ہیں کہ ان اسکولوں میں اُردو کا وجود ہی نہیں ہے اور ۱۹۸۱ء کے مردم شماری میں سنسکرت بولنے والوں کی تعداد ۶۰۰۰ (چھ ہزار) کے لگ بھگ دکھائی گئی ہے) اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ ایک زندہ زبان ہے یا اس کا چلن عام ہے۔ یہی بات فارسی زبان کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے کہ کئی جامعات بنارس و علی گڑھ سمیت، اس کی تعلیم کا انتظام ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ یہاں فارسی کا چلن عام ہے اور ایک بار میں پھر یہی بات دہراؤں گا کہ میرابائی اپنے بھجنوں کے لیے مشہور ہیں نہ کہ گیتوں کے لیے اگر وہ گیت اور بھجن کو ایک ہی صنف مانتے ہیں تو میں اپنا اعتراض واپس لینے کو تیار ہوں۔

آپ نے درست فرمایا کہ موجودہ ہندی زبان یعنی دیوناگری بھی لکھی جانے والی زبان بلائے ناگہانی کی طرح آسمان سے نازل ہوگئی اس کے متعلق تفصیل بعد میں پہلے یہ:

گراموفون کے بارے میں میری بات بچکانہ لگی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میرے گھر اور کئی عزیزوں کے یہاں چابی والا باجا تھا، اور سوئی بدل کر ریکارڈ بجایا جاتا تھا۔ ان دنوں فلمی گیت اتنے عام نہ تھے قوالی، غزلیں اور دادرا وغیرہ جو ریکارڈ پر لکھا ہوتا تھا۔ میرے پاس جو پرانا ریکارڈ ہے ''انہی لوگوں نے لے لینا ڈوپٹہ میرا'' اس پر دادرا لکھا ہوا ہے۔ اختری بائی فیض آبادی آخر میں اپنا نام بتاتی تھیں۔ اس زمانے کی غزل ''دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے'' (شاعر بہزاد لکھنوی) اور ملکہ پکھراج کا گیت ''ابھی تو میں جوان ہوں'' (حفیظ جالندھری) اور وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں، (اختر شیرانی) آج بھی میری یادوں کی بازگشت میں گونج

رہے ہیں جہاں تک برج بھاشا اور اودھی کا تعلق ہے تو یہ اردو رسم الخط میں بھی لکھی جاتی رہی ہے اور میرے پاس ملک محمد جائسی کی پدماوت کی فوٹو کاپی جو میں نے برٹش لائبریری لندن میں خود حاصل کی ہے اُردو رسم الخط میں لکھی ہوئی موجود ہے۔ ثبوت کے لیے وہ محمد حسن کی لکھی ہوئی دیوناگری، ادب کی تاریخ ص: ۷۷ پر صرف اتنا لکھ لیں کہ ''پدماوت کے سارے قدیم نسخے فارسی رسم الخط میں ملتے ہیں'' اگر وہ چاہیں تو یہ کتاب اور دوسری کتابیں میں حاضر کرسکتا ہوں پدماوت کے بارے میں اسی کتاب کے ص ۷۸ پر یہ بھی دیکھ لیجیے.......... ''لسانی حیثیت سے ساری نظم اودھی زبان میں لکھی گئی ہے۔''

اُردو اور ہندی کی ہم سائیگی کے متعلق یہ بات درست ہے کہ دونوں کا تشخص برقرار رہے گا لیکن ہو یہ رہا ہے کہ میرے وطن ہندوستان جنت نشان میں اُردو کے تشخص کو ہر طرح سے مٹایا جارہا ہے اس کی تفصیل میں ابھی نہیں جاؤں گا لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ابتدائی وثانوی سطحوں پر اس کی تعلیم کا گلا گھونٹا جارہا ہے۔

موجودہ کھڑی بولی ہندی جسے میں دیوناگری کہتا ہوں ایک مصنوعی زبان ہے جو ۱۹ویں صدی کے اواخر سے رائج ہوئی۔ اس طرح کہ اردو کے رسم الخط کے بجائے دیوناگری رسم الخط میں لکھ کر عربی اور فارسی کے الفاظ کے بدلے سنسکرت کے الفاظ ٹھوس کر رواج دی گئی۔ یہ اس گنہ گار کی رائے نہیں ہے بلکہ تمام ماہر لسانیات کا فیصلہ ہے۔ مشہور لسانیات کے پروفیسر سنیتی کمار چڑجی کی تصنیف ''انڈو اریّن لنگویج اینڈ ہندی'' کے اُردو ترجمہ ہند آریائی اور ہندی مطبوعہ ۱۹۴۲ء دوبارہ اشاعت ۱۹۶۰ کا صرف یہ حوالہ کافی ہے۔

ناگری ہندی یعنی ناگری حروف میں لکھی اور چھاپی جانے والی سنسکرت آمیز ہندی کے پُرجوش حامی عام طور پر آج یہ بات نہیں جانتے کہ پچاس سال پہلے اس قسم کی ہندی کا آغاز وارتقا کیسے ہوا تھا۔ پنجاب یوپی اور بہار کی عدالتوں میں ایسا کلرک مشکل سے ملتا تھا جو ناگری حروف میں عرض دعویٰ یا کوئی دستاویز لکھ سکے۔ بیشتر تعلیم یافتہ ہندو اُردو پڑھتے تھے۔

ششی ناتھ مترا اپنی کتاب ''کھڑی بولی کا انڈولن'' میں رقم طراز ہیں:

''برج بھاشا میں تمام ملکی وغیر ملکی الفاظ کے ملنے سے اُردو کا ارتقا عمل میں آیا اور اُردو میں سے عربی فارسی کو جان بوجھ کر چھانٹنے میں ان کی جگہ پر سنسکرت کے ٹھیٹھ الفاظ رکھنے سے موجودہ مصنوعی ہندی کا ارتقا ہوا ہے۔''

ص: ۱۶۷ اس لیے اردو کے تمام علاقے جن میں یہ زبان رائج تھی اب ہندی ہارٹ لینڈ کہے جاتے ہیں کہ ان سے اُردو کا اخراج ہو چکا ہے اور اس کے اسباب لسانی سے زیادہ فرقہ وارانہ تھے جن کی جڑیں ہندو احیاء پرست قومیت تھی۔ چنانچہ اکثریتی مذہبی طبقہ نے دیوناگری رسم الخط میں اس نئی زبان کو تقویت دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس اجتماعی دھارے سے کاٹ دیے گئے جو ہندو مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا اور جس میں غیر ہندو کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور دوسرا المناک اثر یہ بھی ہوا کہ چشم زدن میں اُردو ایک اقلیتی زبان

بن کر رہ گئی۔

اُردو کے لیے ہندوستانی کا نام اس خاکسار کا تجویز کردہ نہیں ہے بلکہ اس لفظ کو انگریزوں نے رائج کیا تھا اور جی۔ جی۔ نے بھی ترقی یافتہ مغربی اپ بھرنش کو ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا ہے جو در حقیقت کھڑی بولی کا نکھرا ہوا روپ ہے جسے قدیم اُردو کہا جاسکتا ہے اور ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے اپنے ایک مضمون ''فورٹ ولیم کالج اور ابتدائی ڈکشنریاں'' میں ''ہندوستانی مساوی اُردو کے ذکر کے بعد لکھا ہے: ''اس زبان کا جسے ''ہندوستانی'' کہا گیا ہے (بلاشرکت غیرے) رسم الخط ناگری نہیں تھا بلکہ فارسی عربی تھا۔''

(مطبوعہ اخبار اُردو، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۷ء)

اُردو کے نام کی غرابت کو صرف سیّد سلیمان ندوی سمجھتے تھے اسی لیے وہ ہندوستانی کہنے کے حق میں تھے اور اپنے زیر ادارت شائع ہونے والے رسالے ''معارف'' اعظم گڑھ میں اسی لفظ کو سرنامہ پر لکھا کرتے تھے۔ اس زمانے کے تعارف، کتب خانوی میں دیکھ کر میری بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اسے پاکستانی میں کیا کہا جائے گا؟ کیا امریکہ میں انگریزی زبان کو امریکی کہا جاتا ہے؟ انگریزی زبان میں انگلش کا لفظ انگلستان کے باشندوں کے لیے بھی مشتمل ہے لیکن امریکہ، کناڈا اور آسٹریلیا والے اسے انگریزی ہی کہتے ہیں۔

زبان کے معاملے میں یہاں وسعت قلبی کے بجائے اتنا جھوٹ بولا گیا ہے اور بولا جارہا ہے کہ الحفیظ والا مان۔ دیوناگری والے تو برج بھاشا، اودھی، راجستھانی، بندیل کھنڈی وغیرہ کو اپنی بولیوں میں شامل کرکے انہیں ہضم کر چکے ہیں۔ دوسرا جھوٹ کے موجود دیوناگری بھاشا کو اُردو پر زمانی تفوق حاصل ہے اور یہ سنتے سنتے میرے کان پک گئے کہ اُردو ہندی کی ایک شیلی ہے حالانکہ سچائی اس کے بالکل برعکس ہے۔

کاش! محترم شمس فاروقی صاحب اس سلسلہ کی تصنیفات دیکھ کر اپنے فیصلہ کے متعلق غور وخوض فرمائیں اور نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا کریں۔ یہ دو کتابیں وہاں بہ آسانی مل جائیں گی۔

(۱) اُردو کا ابتدائی زمانہ : ادبی تہذیب وتاریخ کے پہلو

(۲) (Frank E. Keay) کی فرینک ای ''اے ہسٹری آف ہندی لٹریچر''

نوٹ : اسے اس سلسلے کی آخری قسط سمجھا جائے۔ (ادارہ)

❁❁

Address:
Peeli Kothi, Baqargani,
Patna : 800004

سائرہ غلام نبی

مشفق خواجہ کی باقیات

''سخن در سخن'' کے حوالے سے

ادب کی تحقیق میں مصروف ومشغول، مشفق خواجہ جب جب ''خامہ بگوش'' ہوئے۔ان کی زکاوت علمی نے بات کہنے کا نیا ہی ڈھنگ نکالا۔ان کے شوخ قلم نے تیکھے اور طرار فقرے در فقرے یوں تراشے کہ بظاہر اس تراش سے چنداں خراش بھی نہ آئی۔اور کاٹ اندر تک اُترتی چلی گئی۔

مشفق خواجہ نے ساری عمر کتابوں اور مخطوطات کے درمیان گزاری۔ادیب کا ادب سے تعلق ان کی اوّلین دلچسپی تھی۔سو یہی موضوع ان کے کالموں کا حوالہ بھی ٹھہرا۔نٹ کھٹ خامہ بگوش نے ان کالموں میں گویا ناقدانہ فریضہ چھیڑ چھاڑ کے انداز میں انجام دیا۔مزے کی بات یہ ہے کہ اس چھیڑ چھاڑ سے سب سے زیادہ حظ اسی نے اٹھایا جو زیر قلم آیا۔

انہوں نے اپنے ادبی کالموں میں ادباء وشعراء کے غیر ادبی رویّوں پر واضح انداز میں گرفت کی کہ ناگوار و ناخوشگوار اُمور پر ان کا چلبلاتا فقرہ سند بن گیا۔ان کے کالموں کے حقیقی کردار، ان کے طرزِ بیان کی بدولت افسانوی حیثیت اختیار کر گئے۔اور انہیں شہرت دوام حاصل ہوگئی۔ان کے تند وتیز کالم ہفت روزہ اور روزنامے میں شائع ہوئے۔مظفر علی سید نے ان کا انتخاب کر کے تین کتابوں کی شکل میں محفوظ کر دیا۔ان ہی میں ایک ''سخن در سخن'' ہے۔

سب سے پہلے تو کتاب کی ہی اشاعت کے حوالے سے دلچسپ مندرجات دیکھیے۔ایک کالم کی تمہید ہے:

''آج کل کتاب لکھنا اتنا آسان ہو گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کتاب کی جلد سازی ایک مشکل کام نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جلد سازی کے پیشے میں ناکام ہونے والے بھی کامیاب مصنف بن جاتے ہیں۔مشکل کام اگر کوئی ہے تو وہ کتاب کا پڑھنا ہے۔اس مشکل کام کو آسان بنانے کے لیے ہم نے ایک عرصے سے مطالعہ کتب کا شغل ترک کر رکھا ہے۔پُرانے زمانے کے قیافہ شناسوں کی طرح ہم کتاب کا سرورق دیکھ کر اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے اندر کیا ہوگا۔گویا لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیا جاتا ہے۔مگر کبھی کوئی کتاب ایسی بھی ہاتھ لگ جاتی ہے جس کے ظاہر سے اس کے باطن کا اندازہ نہیں ہوتا۔آدمیوں کی طرح کتابوں میں بھی ظاہر و باطن کا فرق نظر آجائے تو مجبوراً مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔آگے ہماری قسمت کہ حاصل مطالعہ مسرت ہو یا عبرت۔''

افتخار عارف محض شاعر نہیں، مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین بھی رہے۔ اور اکادمی ادبیات کے حوالے سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ یہ کالم ان ہی کی علمی و ادبی حیثیت کے پیش نظر لکھا گیا۔ یقیناً یہ کالم انہوں نے بھی ہنستے ہنستے پڑھا ہوگا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں کہا ہوگا۔ ع جان بہت شرمندہ ہیں

''افتخار عارف ہمارے پسندیدہ شاعر ہی نہیں، پسندیدہ موضوع سخن بھی ہیں۔ جب وہ لندن میں تھے تو ہم ہر دوسرے مہینے ان پر ایک کالم ضرور لکھتے تھے، اور یوں جدید ترین ادبی و غیر ادبی رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی تھی، لیکن جب سے وہ پاکستان آئے ہیں، ان کی کالمانہ خوبیوں پر عالمانہ اوصاف نے پانی پھیر دیا ہے۔ آج کل وہ ''مقتدرہ قومی زبان'' کے صدر نشین ہیں۔ اس وجہ سے انہیں غزل گو کے بجائے عالم و فاضل سمجھا جانے لگا ہے۔ مقتدرہ کی صدر نشینی پر ان سے پہلے ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے علمائے خوب متمکن تھے۔ ظاہر ہے ان علماء کی کرسی پر بیٹھنے والا کتنی ہی احتیاط کرے، علم کے جرثوموں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ وہ دن گئے جب علم محنت سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اب تو یہ چھوت کی بیماری ہے ذرا سی بے احتیاطی سے کام بگڑ جاتا ہے۔ اسی لیے تو اسلام آباد میں جسے بھی دیکھیے عالمانہ شان سے چلتا نظر آتا ہے۔ حالاں کہ اس کی عمر ''مجرمانہ شان سے چلنے کی ہوتی ہے۔''

وہ مزید کہتے ہیں:

''مقتدرہ قومی زبان کا صدر نشین ہونے کے بعد افتخار عارف نے شاعری کی طرف توجہ کم کر دی ہے۔ اب ان کا زیادہ وقت ''فرہنگ تلفظ'' اور ''اُردو تھیارس'' جیسی کتابوں پر دیباچے لکھنے میں گزرتا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب موصوف کا نام نامی قاموس الاغلاط، فرہنگ پیشہ وراں اور لغات اضداد جیسی کتابوں پر بطور مرتب شائع ہونے لگے گا۔ افتخار عارف کو قاموس الاغلاط ضرور مرتب کرنی چاہیے۔ یہ کام ان کے لیے نسبتاً آسان ہوگا۔ اس کے لیے مثالیں تلاش نہیں کرنی پڑیں گی، اپنے ہی کلام سے مل جائیں گی۔''

آگے لکھتے ہیں:

''افتخار عارف میں یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں۔ مگر منکسرا!!جی کے معاملے میں وہ خود کفیل ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے انٹرویو سے بھی ملتا ہے۔ اور جو یہ ہے کہ اقبال کے بعد وہ فیض کو سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ وہ اگر چاہتے تو اپنے معنوی استاد یگانہ چنگیزی کی طرح فیض تو کیا، اقبال کو بھی طاق نسیاں کے حوالے کر کے سوال کرنے والے کو یہ جواب دے کر مطمئن کر سکتے تھے کہ یہ ''فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ غالب کے بعد بڑا شاعر کون ہے۔ سب کا کلام آپ کے سامنے ہے اور میں تو بہ نفس نفیس آپ کے سامنے موجود ہوں'' مگر افتخار عارف نے اس قسم کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خود شاعر ہوتے ہوئے فیض کو مسند عظمت پر بٹھانا حقیقت پسندی نہ سہی منکسر المزاجی ضرور ہے۔!''

خامہ بگوش "لوح جہاں پر حرف مکرر" کے عنوان سے شائع ہونے والے اس کالم میں اپنے دوست وشاعر ساقی فاروقی و فراز کی معاصرانہ چشمکوں کو اپنے انداز سے رقم کرتے ہیں۔

کہتے ہیں:

"ساقی (فاروقی) نے اپنے کسی پچھلے انٹرویو میں کہا تھا۔ "فراز کی شاعری مرجائے گی۔" فراز نے جواب دیا تھا۔ "مرتی وہی چیز ہے جو زندہ ہو۔" اب کئی برس بعد ساقی نے زیر نظر انٹرویو میں فراز کے اس معنی خیز جملے کا جواب دیا ہے اور یہ کہا ہے۔ "میں نے یہ کہا تھا کہ فراز کی شاعری مردہ پیدا ہوئی ہے اور مردہ چیز دوبارہ نہیں مرسکتی۔"

ساقی (فاروقی) لاکھ وسیع المطالعہ ہوں، لیکن اردو کی کلاسیکی شاعری انہوں نے اتنی ہی پڑھی ہے، جتنی ان کے بی۔اے کے نصاب میں تھی۔ اگر وہ کسی بھی کلاسیکی شاعر کا مطالعہ کر لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ شعرائے کرام نہ صرف بار بار مرتے ہیں، بلکہ مرنے کے بعد بھی شاعری کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً غالب کہتے ہیں۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا　　　نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

ظاہر ہے یہ شعر غالب نے جیتے جی نہیں کہا ہوگا۔ یہ مرنے کے خاصے عرصے بعد کی تصنیف ہے، جب ان کا مزار تعمیر ہو چکا تھا۔ اسی طرح میر نے جب یہ شعر کہا تھا۔

میرے سنگِ مزار پر فرہاد　　　رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد

تو اس وقت میر خود............ استراحت تھے اور ان سے سینکڑوں برس پہلے مرنے والا فرہاد دوبارہ زندہ ہو کر ایران سے ہندوستان پہنچ چکا تھا۔ پس ساقی فاروقی کو جاننا چاہیے کہ جب شعراء بار بار مرسکتے ہیں تو کسی شاعر کی مردہ شاعری دوبارہ کیوں نہیں مرسکتی؟ دوبارہ تو کیا ہماری شعر کی مردہ شاعری دوبارہ کیوں نہیں مرسکتی؟ دوبارہ تو کیا ہماری شعری روایات کے مطابق ہزار بار مرسکتی ہے اور زندہ ہو سکتی ہے۔

احمد فراز کے خلاف اتنا کچھ کہنے کے باوجود ساقی کے غیض و غضب میں کمی نہیں آئی۔ مزید فرماتے ہیں۔

"پھول کتابوں میں ملیں اور شرابیں شرابوں میں ملیں، والے اشعار رومال اور تکیے کے غلاف پر کاڑھنے کے لیے رہ جائیں گے یا بسوں اور ٹرکوں کے پیچھے لکھے ہوں گے۔" احمد فراز کو آپ کچھ بھی کہہ لیجیے، اس کا کلام رومالوں، تکیے کے غلافوں، بسوں اور ٹرکوں پر نظر آ جاتا ہے۔ مگر احمد فراز کے معاصرین و مخالفین کی شاعری کو تو یہ چیزیں بھی قبول نہیں کرتیں۔ یہ شاعری ہے یا لوح جہاں پر حرف مکرر، تکیے کے غلاموں کی بات چلی ہے تو استاد لاغر مراد آبادی کا ایک شعر سنانے کو جی چاہتا ہے۔ جو ان کی بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر نامدار کے تکیے کے غلاف پر کاڑھا ہے۔

حسین تکیے پر سر رکھ کے سونے والے حسین　　　خدا کرے کہ تری آنکھ عمر بھر نہ کھلے

ادب کے حوالے سے تحقیق کوئی نئی بات نہیں۔ ناکام تخلیق کار عموماً تحقیق سے ہی نام بنانے کی کوشش کر لیتے ہیں اور پر لطف بات یہ ہے کہ بنا بھی لیتے ہیں۔ اس حوالے سے مزید یہ کہ اب تک اس بات پر اتفاق نہیں ہو سکا کہ تحقیق کے لیے ''تختۂ مشق'' کس طرح کے ادیبوں کو بنایا جائے۔

اسی حوالے سے خامہ بگوش ایک کالم میں کہتے ہیں۔

''بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں زندہ لوگوں پر تحقیق ہوتی ہے جو آداب تحقیق کے منافی ہے۔ تحقیق صرف ان پر ہونی چاہیے جو ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ مرحومین پر تحقیق کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ کوئی مرحوم ادیب کسی محقق کو اپنے بارے میں معلومات فراہم نہیں کر سکتا، جب کہ زندہ ادیب ہر ممکن مدد کر سکتا ہے، یہاں تک کہ محقق کی نااہلی کو دیکھتے ہوئے تحقیقی مقالہ بھی لکھ کر دے سکتا ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تحقیق مرحومین پر ہونی چاہیے نہ زندہ ادیبوں پر بلکہ صرف زندہ جاوید ادیبوں کو تحقیق کا موضوع بنانا چاہیے۔ ہمیں اس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ کیونکہ اس اُصول پر عمل کے نتیجے میں ہر زندہ ادیب اپنے آپ کو زندہ جاوید سمجھنے لگے گا۔ ادب کی گردن پر زندہ ادیبوں ہی کا بوجھ ناقابل برداشت ہے، اگر زندہ جاوید ادیبوں نے بھی اس شاخِ نازک پر آشیانہ بنالیا تو صورتِ حال خاصی تشویش ناک ہو جائے گی۔

نثری نظم کہنے والوں کے یہاں ہر طرح کے موضوعات دراتے ہوئے چلے آتے ہیں، جن کا کلاسیکی روایات میں شائبہ تک نہیں ملتا۔ اب یہی دیکھیے۔

شاعری میں گھوڑں کا ذکر خیر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بہت کامل استعارہ ہے جسے غالب نے بھی کئی جگہ مستعار کیا ہے۔ یہی مصرع دیکھیے۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے

خامہ بگوش نے معروف شاعر و نقاد قمر جمیل کی شاعری سے ''گھوڑے'' کس طرح دریافت کیے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھیے۔

''قمر جمیل کی شاعری کا کلیدی لفظ گھوڑا ہے۔ بہت دن ہوئے ان کے مجموعہ کلام ''چہار خواب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ گھوڑے اصطبل اور گھڑ دوڑ کے میدانوں میں تو ہوتے ہیں، لیکن جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے، فردوسی کے شاہ نامے کے بعد ''چہار خواب'' ہی ایک ایسی کتاب ہے۔ جس میں گھوڑوں کو کلیلیں کرتے اور دلکی چلتے دیکھا جا سکتا ہے۔ اب قمر جمیل نے تنقید کے بحرِ ظلمات میں بھی گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے ہیں۔ زیرِ نظر انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں وہ فرماتے ہیں۔ ''پنجاب میں ظفر اقبال اور کراچی میں انور شعور کی شاعری کا گھوڑا دوڑ رہا ہے۔''

"قمر جمیل نے جب میدان ادب میں گھڑ سواری شروع کی تو ان کا گھوڑا غزل کی طرح صبا رفتار تھا، لیکن جب وہ تنقید لکھنے پر آئے تو یہ گھوڑا ایجنٹ ہو گیا۔ اسے قابو میں کرنے کے لیے قمر جمیل نے نثری نظم ہی کی گھڑ نال سے حریفوں کو نیچا دکھایا اور حریف اس طرح خاموش ہو گئے، جیسے گھوڑے بیچ کر سو گئے ہوں۔ قمر جمیل نے خوش ہو کر اپنی نثری نظموں کا مجموعہ گھوڑے کے سامنے ڈال دیا اور وہ اسے گھاس سمجھ کر کھا گیا۔"

اُردو کی شعری تاریخ میں جرأت و انشا، انیس و دبیر، ذوق و غالب کی۔ جوڑی نظر آتی ہیں۔ اور آج کل ایسی تو نہیں، مگر ایک جوڑی نظر آتی ہے۔ جس میں مماثلت و مشابہت خامہ بگوش نے دریافت کی۔ ان کے بارے میں دیکھیے وہ کہتے ہیں۔

"مزاج و عادات اور ادبی طریقہ ہائے واردات کی گہری مماثلت کے باوجود عطا و امجد (عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد) میں علم اور کلاسیکی ادب سے متعلق رویوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امجد بر لحظہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُردو کے کلاسیکی ادب سے تو انہیں عشق ہے۔ جتنا مطالعہ کلاسیکی ادب کا انہوں نے کیا ہے، ان کی نسل کے شاعر اتنا مطالعہ کم ہی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عطا کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جتنا علم حاصل کر لیا وہی کسی کام نہیں آیا تو مزید کیوں حاصل کیا جائے۔ ایک ایسے دور میں جب ہر شخص "ھل من مزید" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے دوسروں کے حقوق تک غصب کر لیتا ہے، عطا کی یہ قناعت پسندی قابل تعریف ہے۔ ویسے بھی وہ علم کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ جوں ہی یہ میل نمودار ہوتا ہے۔ وہ مشاعروں کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ کلاسیکی ادب کے سلسلے میں ان کا خیال یہ ہے کہ جو کچھ پرانوں نے لکھا، وہ ماضی کا حصہ ہے، ہم آج جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ مستقبل کا کلاسیکی ادب ہے۔ ماضی کے ادب کو پڑھنے سے بہتر ہے کہ مستقبل کے کلاسیکی ادب کو پڑھا جائے۔ عطا مستقبل ——— ادب خود تخلیق کرتے ہیں اور پھر اس کو پڑھتے ہیں۔ مطالعے کا یہ انداز صبر آزما ہی نہیں ہمت طلب بھی ہے۔ یہ کچھ ایسی ہی بات ہے کہ پیاس لگے تو پہلے کنواں کھودو، پھر پانی پیو۔"

خامہ بگوش عرف مشفق خواجہ اگر مان لیا جائے تو ان کے یہاں شعری لوازمات سے استفادہ جا بجا نظر آتا ہے۔ ان کی نثر سے محظوظ ہونے کے لیے قاری کا صاحب علم و ادب ہونا بنیادی شرط ہے۔ ورنہ وہ بے پایاں لطف و انبساط سے محروم رہ جائے گا۔

اب دیکھیے:

"جاپان ہماری قومی اور نجی زندگی میں اس حد تک دخیل ہو چکا ہے کہ ہماری ضرورت کی ہر چیز وہیں تیار ہوتی ہے۔ کاروں سے لے کر بال پوائنٹ پین تک اور ٹی وی سے لے کر بچوں کے کھلونوں تک شاید ہی کوئی چیز ہو جو جاپان سے نہ آتی ہو۔ ہم رہتے تو پاکستان میں ہیں، لیکن سانس جاپان میں لیتے ہیں۔ (یہ بھی غنیمت ہے کہ قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے پاکستانیوں کو کہیں تو سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔) ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ

ضروری چیزوں کے ساتھ ساتھ غیر ضروری چیزیں بھی جاپان سے آنے لگی ہیں اور ہائیکو بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔

ہم نے اُستاد گرامی سے پوچھا، آپ نے بھی اس کھلونے سے دل بہلایا ہے۔ فرمایا، کیا ہائیکو اور کیا ہائیکو کا شوربہ، یہ صنف کسی بڑے خیال کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ ہم نے عرض کیا۔ آپ کے خیالات غزل میں بھی پوری طرح نہیں سما سکے تو ہائیکو سے کیا شکوہ۔ فرمایا یہ شکوے شکایت کی بات نہیں، اُصول کی بات ہے۔ جاپان نے صنعتی میدان میں ترقی کی ہے تو ہم بھی صنائع بدائع کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ہمارے پاس پہلے ہی بے شمار اصناف سخن ایسی موجود ہیں جو استعمال میں نہیں آرہیں۔ ایسی صورت میں کوئی صنف سخن باہر سے منگوانا تکلف بے جا ہے اور پھر یہ بھی تو دیکھیے، جاپان سے جو چیزیں آتی ہیں، بالکل نئی ہوتی ہیں تو صنف سخن بھی نئی ہوتی تو کوئی بات تھی۔ ہائیکو صدیوں سے جاپانیوں کے استعمال میں ہے۔ ایسی گھسی پٹی چیز منگوا کر اپنے استعمال میں لانا ایسا ہی ہے جیسے کسی کی قمیض پہن لی۔"

اور آگے دیکھیے:

"ہم نے عرض کیا آخر امریکہ سے پرانے کپڑے آتے ہی ہیں، کیا ہم انہیں پہنتے نہیں؟ فرمایا جن کا یہ شوق ہے، ان ہی کو مبارک ہو۔ میرے ادبی قد وقامت کے لیے ہائیکو کا جامہ نا کافی ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی تو ہم نے اس کی وضاحت کے لیے گزارش کی۔ کہنے لگے، آپ نے جاپانی ٹیکسٹائل ملوں کے کیلنڈر دیکھے ہوں گے۔ ان میں بارہ مہینوں کے بارہ ورق ہوتے ہیں اور ہر ورق پر ایک تصویر ہوتی ہے۔ کپڑے کے اشتہار کے ہر تصویری پیکر کے جسم پر چار گرہ سے زیادہ کپڑا نہیں ہوتا۔ اتنا کپڑا تو غالب کے زمانے میں عاشقوں کے گریبانوں پر صرف ہوجاتا تھا۔ ہائیکو کا بھی یہی حال ہے۔ یہ چار گز بلکہ ہائیکو کے تین مصرعوں کی رعایت سے تین گز کپڑا کسی بھی مناسب شعری قد وقامت کے لیے ناکافی ہے۔"

آج خامہ بگوش ہم میں نہیں ہیں، مگر ان کی زندہ تحریریں ہمارے سامنے ہیں۔ اور جب ہم نہیں ہوں گے تب بھی یہ کتابیں ہوں گی، اور خامہ بگوش زندہ رہیں گے۔ اور مشفق خواجہ بھی کہ تحقیق تو بہرحال ان کا مرض تھا ایسا کہ ہم میں کوئی بھی ایسا بیمار نہیں جس کی دوا وہ خود ہی جانتا ہو۔!

Address:

عین سلام

پھیلا اَمبر۔ پیاسا پانی

پھیلا اَمبر۔ پنچھی وانی
بہتی ندیا۔ پیاسا پانی
گھرتا بادل
نگری نگری
جنگل جنگل
پَربت پَربت
چھایا ساگر
وادی وادی
خالی گاگر
چاہت چاہت
دُکھ دُکھ سارا
اُڑتا پَل پَل
جیون دھارا
رُت ست رُت سَت
پھیلا اَمبر۔ پنچھی وانی
بہتی ندیا۔ پیاسا پانی

❁❁

Address:
C/o 24-A, Chaman, Housing Scheme
QUETTA (Baluchistan)

عصمت دُرّانی

نوروز

ابابیل آئی
یہ پیغام دینے
کہ سردی کے دن کٹ چکے ہیں
درختوں پہ
شفتالوؤں کے
شگوفے کھلے ہیں
ہواؤں نے
خوشبو کی پوشاک پہنی ہوئی ہے
شمیم دلآویز سے
خاک مہکی ہوئی ہے
ابابیل مہکی ہوئی خاک کا
نغمۂ سرمدی گا رہی ہے
وہ افلاک سے
خاک کی سمت
بہتی ہوئی آرہی ہے
وہ دیکھو!
فضا اُس کی پرواز سے تھرتھرائی
وہ دیکھو
ابابیل آئی!

❁❁

Address:
C/o 24-A, Chaman
Housing Scheme
QUETTA (Baluchistan)

وحیدالحسن

۱۔ مبارک باد!

خط نہیں لکھتے
کارڈ بھیج دیتے ہیں
اپنے جذبات کی
ترجمانی کے لیے
الفاظ بھی پائیں کہاں؟
قرض کے الفاظ ہیں
اور جذبے مستعار
پڑھے لکھے زمانے میں
بڑا ان کا سہارا ہے
حقیقت ہے جہاں
نقاب اندر نقاب
بڑے مخلص طریقے سے
یہ خوشنما رنگین کارڈ
ہمیں باور کراتے ہیں
آپ تو ہیں خوش نصیب
آپ ہیں میرے قریب!

۲۔ بدگمانی

کل کسی نے کیا دریافت
کیا یہ پھول اصلی ہیں؟
ایک لمحے کو رکا
ان کی طرف دیکھا
کیا قدرت نے رنگ کھوئے ہیں
تازگی جاتی رہی ان کی
کیا تازگی میں کمی آئی
یا ان کی خوشبو ہے
کسی عطار کی سازش
اگر ایسا نہیں تو پھر
ہماری آنکھ
حق بینی سے عاری ہے
اسے سچ سے بدگمانی ہے
اور باطل پہ ایماں ہے!

❀❀

Address:

370 OAK VISTA Lawrence Ville
G.A. 30044 (U.S.A.)

وحید الحسن

۳۔ ترجمان

میں ان کی ترجمانی کر رہا ہوں
جو لفظوں کی حرمت سے ہیں نا آشنا
صرف اونچے بول سنتے ہیں،
جو آواز کی صوات
ان کے کانوں میں اترتے ہیں
جب کبھی دھیمے سروں میں
کوئی بات کرتا ہے
انہیں استعجاب ہوتا ہے
کیا وقت ہے بدلا
الفاظ جب خوشبو سے
معطر ہو کے آتے ہیں
سوچتے ہیں فصل پک گئی شاید
الفاظ میں تندی کا عنصر
لگتا ہے کسی خودکش نے اپنا کام کر ڈالا
الفاظ جب کانوں بس گدگدی پیدا کریں
تو اک پرانی سی خلش سینے میں
کروٹ لینے لگتی ہے
بیتے دنوں کے سرخ پھولوں کا موسم
لہلہاتا ہے
الفاظ ڈھونڈھے سے نہیں ملتے!

۴۔ یہ راہ ہماری

(ندا فاضلی کے نام)
خدا نے کہا تھا
یہ راستہ ہے سیدھا اسے اختیار کر لو
عافیت کا ضامن، بھلی منزلوں کا بشیر ہے
مگر جو چاہو کوئی اور راہ لے لو
تمہاری منزل پہ تم کو کیا ملے گا یہ تم ہی جانو
نبی کہا تھا
راہگیروں کو ان کی منزل بتا تو دینا
مگر اپنی رائے دے کر یہ چھوڑ دینا
وہ اپنے احوال کے ہیں مالک
کبھی کہا تھا
بھٹکنے والوں کے لیے اماں نہیں ہے
ان کی گردن پہ حق ہے شمشیر کا
خدا کے نزدیک راہیں کئی تھیں
مگر ہمارے اجالے اندھیرے کے درمیاں
کوئی جھٹپٹا نہیں ہے
ترکِ تعلقات کو ہے لاتی بنایا
ساتھ میرے ہو یا مجھ سے دشمن ہے!
یہ سمجھ نہ پائے کہ
دشمنوں کے علاوہ بھی لوگ ہوں گے
دوستوں کے علاوہ بھی لوگ ہوں گے

یہ زندگی ہے
زندگی کے ہزار زاویے ہیں
مگر ہم یہ چند ہیں اس پہ
بس اک ڈگر ہے اور کوئی راستہ نہیں ہے
پیر جس کے نہیں ہیں اس پر
وہ صفِ دوستاں سے ہوتا ہے خارج
دشمنی کا عذاب اس کے سر ہے
غیض و غضب اور عتاب اس کے سر ہے
دشمنوں کی صف کو آراستہ کر لیا ہے ہم نے!!

❁❁

Address:
370 OAK VISTA Lawrence Ville
G.A. 30044 (U.S.A.)

امجد اسلام امجد

آتشِ رفتہ کا سراغ

کیسی آتش لگی ہے تن من میں!
کیسے شعلوں میں جل کے آئے ہیں
قطرہ قطرہ پگھل کے آئے ہیں
تیری محفل میں حاضری کے لیے
کیسے کیسے جتن کیے ہم نے
روپ کیا کیا بدل کے آئے ہیں

یوں نہ کر اب سوال کی توہین
یہ ادھورے جواب رہنے دے
تجھ سے ممکن نہیں جو چارہ گری
درد کو بے حساب رہنے دے
دل سے لے جا ہر ایک یاد اپنی
بجھتی آنکھوں میں خواب رہنے دے

اس قدر مفلسی میں پاس مرے
یہ دھواں چھوڑتا چراغ سہی
کچھ تو خانہ خراب رہنے دے

❁❁

Address:
275-N, Defence Housing Athority
LAHORE

یوسف امام

چاند کا ٹکڑا

امریکہ میں قیام کے دوران ایک دن
مجھ کو ہوا جو شوق
علم خلانوردی سے کچھ آشنائی کا
ہوسٹن کے شہرہ یافتہ ناسا چلا گیا
سرگرمیٔ اُمور فلک بینی دیکھنے
تفتیش نظم عرش کا یہ مرکز عظیم
میلوں پہ تھا محیط
تحقیق و تربیت کے ادارے تھے مختلف
سرگرمیاں بسیط
جن میں عروج ذہن بشر کی نمود تھی
اور تھا حصار فکر میں محصور آسماں
تنظیم و تربیت کے اداروں کے درمیاں
حیرت کدہ تھا ایک نمائش گہہ شہیر
مخزن تھا جو علوم خلائی نظام کا
شیشوں میں واں تھے دیدنی نادر عجائبات
وابستہ جن سے عرش نوردی کی تھی مہم
مشتاق میری چشم تجسس نے لی وہاں
ماہ اور دگر نجوم کی ہیئت کی آگہی

(۲)

تھے مرکز خلا کے احاطوں میں دور تک
استادہ جابجا
راکٹ خلانوردی سے لوٹے جو کامراں
کولمبیا کے ساتھ پولو بھی نصب تھا
دونوں کو افتخار تھا تسخیر ماہ کا
راکٹ یہی تو تھے
لے کر گئے جو چاند پر اڈون کو نیل کو
(مامور جو سفیر تھے تسخیر ماہ پر)
منزل قمر کی پا کے بڑے احتیاط سے
بحر سکون ماہ پر ایگل اتار کر
پہلا قدم بشر کا رکھا جب کے نیل نے
تاریخ ساز جملہ کہا انبساط سے
"گو یہ قدم بشر کا بہ ظاہر ہے
انساں کی ایک جست بلند و دراز ہے"

(۳)

واپس ہوئے تو چاند سے لائے خلانورد
مٹی کی پتھروں کی جو سوغات بے بہا
حیرت کدہ کے شیشوں میں رونق فزا تھے وہ
اہل زمیں کے ذوقِ نظارہ سے بہرہ مند
دیکھا جو ان کو فرط تحیر سے بار بار
کیف و نشاط چشم تماشا ہوئے فزوں
ہیئت تھی سطح مہ کی نہاں ان کی ساخت میں
تھے بے بہا کہ شاہد تسخیر ماہ تھے
اور راز دان کن تھے خلائی نظام کے

ان پتھروں کا رنگ
تھا سُرمئی کسی کا، کسی کا سیاہ تھا
لیکن کوئی بھی ان میں جمیل و حسیں نہ تھا
روشن جبیں نہ تھا
ان میں تو چاندنی سی کوئی دلبری نہ تھی
ناعرنوازِ نورِ جنوں خیز ہی نہ تھی
ان پتھروں کی دید سے تصدیق یہ ہوا
عاری ہے سطحِ ماہ حسیں رنگ و نور سے
رنگت میں اس کی کوئی بھی اپنی کشش نہیں
رخشندگی تو غیر سے ہے اس کی مستعار
آیا مجھے خیال کہ ہے کتنی پُر فریب
تشبیہ اک قدیمی ہمارے سماج کی
تہذیب میں ہماری ہے صدیوں سے یہ چلن
توصیف اپنی دخت کرتے ہیں اس طرح
کہتے ہیں یہ جمیلہ ہماری ہے ماہ وش
بس جان لیجیے کہ یہ ٹکڑا ہے چاند کا
یاد آئی یہ مثال تو میں سوچنے لگا
ہر توے آفتاب کے ہے کتنی گمرہی
گو ہے اسی کا فیض کہ ہے چاندنی خنک
اور ہے ازل سے حسنِ شبِ مہہ فسوں طراز
لیکن یہ دلفریب مہہ و نور کی ساحری
اہلِ زمیں کے باب میں ہے پُر فریب بھی

❀❀

Address:
Post Box # 21025
SHARJAH (U.A.E.)

1. EDWIN BUZZ ALDRIN
2. NEIL ARMSTRONG
3. Sea of Tranquility
4. Winer Module Eagle

فہیم جاوید

خواب

کوئی تمنا
حسرت کی اک چادر اوڑھے
تنہائی کے خیمے سے
باہر نکلی
دیکھ رہی ہے!

کوئی فرشتہ
انساں بن کر
لعنت کو ٹھکرا کر
صرف اسی کو اپنانے
گھر تک چل کر آیا ہے!

❀❀

Address:
Post Box # 833
Riyadh : 11421 (U.S.A.)

یعقوب تصور

فطرت

پڑے تھے راہ میں پتھر
کہ جن کی سخت گیری سے
مسافر سے مسافت ڈھنگ سے
طے ہی نہ ہوتی تھی
سو وہ پتھر اُٹھا کر
اک کنارے کر دیے سارے
گلستاں میں خزاں کے بعد
کانٹے اور چوب خشک کے
انبار تھے ہر سو
کہ چلنا تھا وہاں دوبھر
انہیں بھی راستے سے دور
اک گوشے میں لا رکھا
اور ایسے ہی بہت سے کام
کر ڈالے نہ جانے کیسے جذبے میں
یہ ان آسانیوں کا ہی صلہ
مجھ کو ملا پیہم
کہ اب رہزن
چلے آتے ہیں آسانی سے جب چاہیں
مرے گھر تک......!
بہت سے کام ایسے
جو میں نے کیے
بہت رویا
مگر وہ پھر بھی کرتا ہوں

❁❁

خاموش رہتا ہوں

میں اپنی ذات سے واقف نہیں ہوں
ہاں مگر سارے ہی احباب
اقرباء اطراف میں مرے
جو کہتے ہیں
کبھی اوصاف سے مرے
کچھ اس طرح سے واقف ہیں
کہ جیسے وہ مری رگ رگ میں پنہاں ہیں
مری ہر ایک خامی
جس کا مجھ کو بھی نہیں ہے علم
وا ہیں ان کی نظروں میں
وہ کہتے ہیں کہ میں
بے راہروی کی نہج پر ہوں گامزن
مغرور ہوں
سنتا ہوں سب کی
بولتا کم ہوں
یہ سب باتیں۔ تکبر کے اشارے
اور نجانے نقص کتنے ہی
ہیں مری ذات سے منسوب ایسے ہی
کہ میں خود بھی ہوں حیرت میں
میں اپنی ذات سے واقف نہیں ہوں
ہاں مگر اقرار ہے پیہم
کہ یہ خامی تو ہے مجھ میں
کہ بے مقصد بلا فہم و ذکا، ادراک سے خالی
اگر ہو گفتگو کوئی تو میں خاموش رہتا ہوں

❁❁

یعقوب تصور

اندھیری صبح

ظلمت شب کی چادر گھنیری رہی
خواب کی تابنا کی اندھیری رہی
وقت سرعت سے
محوِ سفر ہی رہا
ایک خواہش کہ سینے میں
پلتی رہی۔ روشنی چاہیے
روشنی کی طلب اور دل کی تڑپ
خوب بڑھتی رہی
اور نوشتِ شب تار بڑھتی رہی
ہاتھ محوِ دعائے تجلی رہے
لمحہ لمحہ دعاؤں میں کٹتا رہا
شدتِ التجا میں کمی کیا رہی؟
ان دعاؤں کو مقبولیت تو ملی
سحر کی بانگ سن کر یقیں ہو گیا
پو پھٹی۔ پو پھٹی
صبح ہو بھی گئی
صبح ہو بھی گئی۔ یہ عجب ماجرا یہ عجب سانحہ
رات گزری نہیں
اور اندھیرا رہا

❁❁

Address:
Post Bux # 4628, ABUDHABI
(U.A.E.)

انتقام

جب اس کو دیکھا
وفا کے ویران گھر میں
اکثر
محبتوں کے چراغ دیکھے
خزاں کی آلودگی میں
ہر سُو مہکتے تازہ گلاب دیکھے
حیات تیرہ تھی پھر بھی دل نے
نجوم و مہ، آفتاب دیکھے
حصار دید وفا طلب میں
ہمیشہ رنگین خواب دیکھے
اگر چہ خوابوں کی وسعتوں میں
نہیں ہے سرحد مگر جہاں ہے
وہاں سے تعبیر کی تمنا بھی سر اٹھائے
مگر نتیجہ؟
تضاد تعبیر و خواب میں ہے
میں سوچتا ہوں کہ میں نے کیوں
اس کے خواب دیکھے
تو اب ہے دل میں
یہی تمنا
کبھی وہ
مرے بھی خواب دیکھے

❁❁

یٰسین افضال

دفن کردو

بند کھانا تھا مرا
پانی اُتر آیا تھا سارے جسم میں
میں سوکھ کر کانٹا ہوا جانے لگا تھا
مت گھسیٹو لاش میری اور کانٹوں میں
چلی تھیں پسلیاں
دل کھینچ کے آیا تھا لبوں پر
موت کی آواز سن کر بھی مری
تم آنہ پائے تھے بچانے
درمیاں مجبوریوں کی
پھر کوئی دیوار حائل، ہو گئی ہو گی
خدا تم کو یوں ہی
محفوظ بچوں کے سروں پر
حشر تک رکھے
اگر تم جاں کنی میں حشر میرا دیکھ بھی لیتے
تو کیا کرتے
کفن میں لاغری میری چھپا دی ہے جہاں
لاچاریاں اپنی زمانے سے چھپا لو
پوچھنے والوں سے کہہ دینا
اچانک موت میری ہو گئی تھی
مجھ کو کاندھوں پر اُٹھا کر
قبر کے اندر اُتار دو
سونپ دو
منکر نکیر مرگ
مٹی سے میرا منہ
زباں تک بند کر کے
راز افشانی کا خدشہ دفن کر دو
آنکھ سے اشکِ ندامت کی طرح
اندر اُتر کر
میں تمہیں
احساس اپنے زندہ ہونے کا
دلانا چاہتا ہوں
دس طرح کا روگ لاتی ہے ضعیفی
سانس الگ کمرے میں
گھٹ کر رہ گئی تھی
اس میں میری کیا خطا تھی
تھی خطا میری تو یہ تھی
گھر کی دیواروں سے
دیواریں نکالی جا چکی تھیں!

(انتقال سے ایک دن پہلے کی نظم)

❁❁

Address:
Mrs. Yaseen Afzal
A-145, Block 12
Gulistan-e-Jauhar Karachi.

صبا اکرام

وہ آخر کون ہے

یہ کیسی یاترا ہے
کھوج میں کس کی ازل سے
چل رہا ہوں
ٹھوکریں کھاتا ہوں
صحراؤں میں، جنگل میں
سلگتی دھوپ میں
لے کر روپہلی اور ٹھنڈی
چھاؤں کے خوابوں کی چھتری
میں چلا جاتا ہوں
آندھی آئے تو
اَن دیکھے ہاتھوں کی کوئی زنجیری
تھامے ہوئے طوفاں سے لڑتا ہوں
جو بارش تیز ہو
تخیل میں اپنے بسے
چھتنار برگد کے تلے
مٹی کا اپنا تن لیے
خیر و سکوں کی سانس لیتا ہوں
کہ پھر بارش کے تھمتے ہی
نکل جاتا ہوں اس کی کھوج میں
انجانے رستوں کی طرف
لیکن مجھے اس بار
رستے میں کوئی سایہ
ہیولا
یا اُجالوں کا کوئی ہالہ
نظر آیا تو پوچھوں گا
بتا دے
ایک مبہم سا تصور بھی نہیں جس کا
وہ آخر کون ہے!

❀❀

Address:
C-102 Rufi Sweet Home
Gulshan-e-Umair,
Opposite Raee Club

شہلا نقوی

کربلا کوفہ کراچی

کاف سے کربلا، کوفہ، کراچی
جہاں ہے روز الم
اور ہے ایک ساعت خوف
وہ نفرتوں کا دھماکہ
وہ خونچکاں لمحہ
وہ تار تار ردائے سکوں
خون میں تر
مکین شہر کے بے دست و پا
لہو میں تر
شب سیاہ میں روشن چراغ گل ہو کر
کہیں ستاروں کی محفل میں جگمگاتے ہیں
وہ کشتیوں کے مسافر ہوں
یا ہوں صحرا نورد
اندھیری رات میں جب راستے کو ڈھونڈتے ہیں
زمیں کے رستوں میں
اور آسماں کی راہوں میں
یہ جلتی مشعلیں
ان کا نشان بنتی ہیں!

❀❀

Address:
15 Daniels, White Planes
New Yourk : 10604-2303
(U.S.A.)

تیرا ساتھ۔۱

گرم رستے پہ
لُو کے جھکڑ میں
گیلے کائی لگے
مٹکوں کی سبیل
جس کے پانی سے
لبالب پیالہ
اپنی خنکی سے
دور کر دے تکان

❀❀

تیرا ساتھ۔۲

قفل خموشی توڑ کے دونوں
اتنا شور مچائیں
سوئے ہوئے لمحے جاگ اُٹھیں
بیتے دن لوٹ آئیں
تو میری یادوں کے در پر
دستک دے
میں تیری
گویا اٹکن بٹکن کھیل کے
اپنا وقت بتائیں!

❀❀

شہلا نقوی

خواب کیسے ہوتے ہیں

خواب، خواب ہوتے ہیں
جاگتے میں دیکھے تو
راستے کا ہر پتھر
اک چٹان کی صورت
سامنے کھڑا ہوگا
خواب، خواب ہوتے ہیں
آنکھ موند کر دیکھو
پھیلتی دھنک میں ہے
شوخ رنگ موسیقی
سات سر کے ساتوں رنگ
رات نرم مخمل ہے
دن کی دھوپ دھیمی آنچ
روشنی اندھیرے میں
چاندنی سویرے میں
خواب ساحلوں کی ریت
جگمگائے آنکھوں میں
شیر اور دو بچے
اس پہ کھیلتے ہوں گے
صبح چاند کا سایہ
شام ڈوبتا سورج
پیار اس کی آنکھوں میں
ساتھ اس کا راہوں میں
سب ہے خواب میں ممکن
خواب، خواب ہوتے ہیں!

❀❀

زرد گلاب

درد کی شاخ پہ مہکا ہوا
جذبے کا گلاب
آرزوؤں سے لہو رنگ
مہکتا ہوا خواب
اب کی رُت
میرے چمن میں نہ کھلا
صرف کیاری میں بچا
زرد حسرت کا
یہ افسردہ گلاب

❀❀

Address:
15 Daniels, White Planes
New Yourk : 10604-2303
(U.S.A.)

پروین شیر

کیوں؟

زندگی ایک دریا ہے غم کارواں
جوق در جوق سب لوگ بہتے ہوئے
جا رہے ہیں کہاں؟
کوئی نادیدہ منزل ہے، جس کی طرف
کیوں مسلسل بہے جا رہے ہیں سبھی؟
ہر طرف دھند ہے
کہر آلود ہے آب جو کی فضا
چاروں طرف
شور و غوغا بپا ہے کہ آگے بڑھو
کچھ تو مضبوط اونچے جہازوں میں ہیں
اور کچھ رخنہ رخنہ ہوئی کشتیاں
چپّوں کے سہارے چلاتے ہوئے
آگے بڑھنے میں کوشاں ہیں جی جان سے
اور کچھ وہ بھی ہیں
تیر کر جن کو جانا ہے اس دھند میں
تند طوفاں سے، لہروں سے لڑتے ہوئے
سب رواں ہیں مگر ایک ہی سمت کو
جس طرف دھند ہے
جو ہیں اونچے جہازوں میں بیٹھے ہوئے
کتنے محفوظ ہیں
ان کو طوفان کا کوئی خدشہ نہیں
یہ سفر اک تماشا ہے ان کے لیے:
اپنی ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں جو ہیں
اور وہ جن کو خود تیرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں
ہانپتے ہیں، مگر
لڑ رہے ہیں وہ پانی کی یلغار سے
سب کی منزل وہی
اور دریا وہی!
کوئی پوچھے تو کس سے کہ آخر یہ سب
کیوں ہیں اِک دوسرے سے الگ اس طرح!

❁❁

Address:
126 Vineland Crescent
Winni peg R3Y IT6
MANI TO BA (CANADA)

پروین شیر

اندھیر

گلی کے موڑ پر رک کر سنو، ٹھہرو!
وہ دائیں سمت اک تاریک، بوسیدہ گھروندہ
ہے
پرانے چرچراتے بند دروازوں کے پیچھے سے
صدا رونے کی سنتی ہوں!
کسی کی سسکیاں، آہیں
دلوں کو چیر جاتی ہیں
نہ جانے کون رہتا ہے یہاں جس کے مقدر میں
فقط رونا ہی لکھا ہے!
ذرا سا دور ہٹ کر بائیں جانب
ایک اونچی سی عمارت ہے
جہاں ہر پل چراغاں ہے
در و دیوار سے جیسے خوشی کے پھول جھڑتے ہیں
سریلی نغمگی دل کو لبھاتی ہے
نہ جانے کون رہتا ہے یہاں جس کے مقدر میں
فقط آسودگی، خوشیاں ہی خوشیاں ہیں!
جو دیکھا پہلے گھر میں تو
اکیلی ایک بوڑھی ہے
بہت ہی ناتواں اک ہڈیوں کا جیسے پنجر ہو
وہ اپنا سر دیے گھٹنوں میں زار و زار روتی تھی
اُدھر جگ مگ عمارت میں
توانا، نوجواں تھا، جھومتا، گاتا
وہ روشن قمقموں کے رنگ جیسے رقص کرتا تھا
کہ اک جانب لڑائی ہار کر روتی ہے سچائی
لڑائی جیت کر لیکن
مبین و کامراں ہے جھوٹ فرطِ تمکنت سے ہنس
رہا ہے
دوسری جانب!

❁❁

Address:
126 Vineland Crescent
Winni peg R3Y IT6
MANI TO BA (CANADA)

نجم عثمانی

کیوں ہتھیار اُٹھائے ہیں کچھ لوگوں نے

مندر، مسجد، درگاہوں میں
بم پھٹتے ہیں
جھوٹے سچے الزامات میں
بے قصور انساں پھنستے ہیں
ریل کی پٹری اُڑ جاتی ہے
بس میں دھماکے ہوتے ہیں
دولت کا انبار ہے
کچھ لوگوں کے گھر
فاقوں کی بھرمار ہے
اور بہت سے
لیڈر اور سرمایہ دار
کالے دھندے کا بیوپار
افسر ہوں یا چوکیدار
گرم ہے رشوت کا بازار
مذہب کا جھوٹا پرچار
نفرت کا ہے کاروبار
جمہوریت کا قتل ہوا ایوانوں میں
کیا اسباب ہیں آخر
انتہا پسندی کے؟
کیوں ہتھیار اُٹھائے ہیں کچھ لوگوں نے
جنم دیا ہے کس نے دہشت گردی کو

❁❁

Address:
New Colony, Wasseypur
DHANBAD (Jharkhand)

دوپہر کا کھانا

وہ بچے جنہیں دوپہر کا
کھلاتے ہیں کھانا
حکومت کی جانب سے
ہر روز
اسکول میں اب
وہ معصوم بچے
بھوک جن کو ستاتی ہے ہر دَم
بھوک اپنی مٹانے لگے ہیں
اسکول آنے لگے ہیں
اس طرح قوم کے سامنے
اپنا اک ایسا چہرہ دکھانے کی کوشش میں
ہو منہمک تم
غریبوں کے بچوں کی تعلیم کی فکر
فقط، تم سے بڑھ کر کسی کو نہیں ہے
مگر ان کو تعلیم کچھ ایسی دی جا رہی ہے
کہ تعلیم پہنچ سے بہت دور ہو جائے گی
جواں ہو کے اک ایسے طبقے میں تبدیل ہونے پہ
مجبور ہو جائیں گے
وہ طبقہ کہ جس پر بہ آساں
حکومت کرو تم
خدا جانے کب
ایسے بچوں کی تعلیم کا
کوئی معیار ہوگا!

❁❁

عبدالاحد ساز

ایک سرمئی تجدید

آج اک نظم جاگ اٹھی پھر سے؟
جو کسی کے لیے کہی تھی کبھی
اور دھری کی دھری رہی تھی کبھی
وقت کی تہہ سی جم گئی تھی جہاں
خواب کی لے سے تھم گئی تھی جہاں
آج دھڑ کا اسی بیاض میں دل
کسمسائے وہ منجمد اوراق
وہی مضموں، مگر سیاق نئے
وہی محراب جس میں طاق نئے
اک نئے زاویے سے پھر مائل
اپنے بین السطور کی جانب
اک نئے بند کا تقاضہ لیے
بحر کے پُرسکوں سمندر میں
گم شدہ موج کا اضافہ لیے
اک خم رہ پہ بعد مدت کے
ہم نگاہی سے ہم کلامی تک
کچھ گریزانہ سی فضا جس میں
مضطرب کتنے رمز و راز کے رنگ
تہہ نشیں غم کا مشترک آہنگ
گوشۂ لب پہ طنز کا سا بھرم
خشک آنکھوں میں اک خفیف سا نم
بیل زیریں سا حرف لطف و کرم
وقفۂ عمر پردۂ مہ و سال
واقعے حادثے نشیب و فراز
مسئلوں مرحلوں کی راہِ دراز
جس کے گرد و غبار میں غلطاں
نیم روشن سی آرزوئے نیاز
اور سفید و سیاہ کے مابین
ربط کا سرمئی تفاہم سا
زلف کے خم میں تار چاندی کے
جن میں محفوظ اک ترنم سا
ذہن کی گفتگو میں دل کی دھمک
پختگی شعور کی رو میں
کسی جذبے کی کم سنی کی چمک
جس طرح شوق چاہتا ہو فرار
تجربے کی نگاہِ شاطر سے
التفات و لحاظ و خاطر سے
آج اک نظم جاگ اٹھی پھر سے!

❀❀

Address:
Abdul Ahad Saaz
Mohd. Haji Adam and Co.
84, Chakla Street
Mumbai 400003 (India)

سحر علی

فیصلہ

اس راستے پہ کئی موڑ ہیں
منزل کا پتہ میری مٹھی میں بھیگ چکا ہے
اندھیرے کی گواہی پر نئے سورج نکلتے ہیں
ہم تمام عمر جن راستوں پہ چلتے ہیں
وقت پڑ جائے تو وہ بھی انجان ہو جاتے ہیں
رات کا سفر دن کی تلاش میں رہتا ہے
دھوپ کو بُرا مت کہو
چھاؤں کے آنسو دھوپ کی نرمی پی جاتا ہے
اوس کی کہانی آدھی رات سے شروع ہوتی ہے
کہ ڈوبی ہوئی نیند کا کنارہ
صبح کے ستارے سے جا ملتا ہے
کنکر چنتے ہوئے ہاتھ ریشم میں الجھ جاتے ہیں
اور الجھے ہوئے خوابوں کا اک سرا پکڑتی ہوں
تو ایک چھوٹ جاتا ہے
نفرت دیوار اٹھاتی ہے
مگر محبت ہمیشہ پل بناتی ہے
میں اس پل پر ایک شام جسے دینا چاہتی تھی
اسے رات کی ناگن نے ڈس لیا ہے
اور ڈسا ہوا آدمی
زود محبت دے سکتا ہے
اور زود محبت نفرت سے مہلک ہے
اب میں اس راستے پر کوئی موڑ لینا نہیں چاہتی
میں چاہتی ہوں اب خوابوں کی تلاش میں
میں نہیں، خواب میری تلاش میں نکلیں!

❁❁

Address:
R-166, Sector 15-A/3
Baffer Zone, North Karachi.

سحر علی

محبت کا وہم

فاصلوں نے گھر کی چوکھٹ دیکھ لی ہے
اُکتائی ہوئی شام میں
گفتگو کافی رسمی ہو چکی ہے
وہ تم سے
آپ پر آ چکا ہے
یہ محض میرا شک نہیں ہے
واقعی اس کا شبنمی لہجہ اب آنچ دینے لگا ہے
جمی ہوئی برف لہجے کی تمازت سے بھی
پگھل سکتی ہے
مگر ٹھنی ہوئی خاموشی سے نہیں
نادیدہ ہاتھوں نے بدگمان لمحوں سے مل کر دیوار
چننا شروع کر دی ہے
اور چنی ہوئی دیواروں میں در نہیں ہوتے
گلاب موسموں پر کسی سبز قدم کا سایہ پڑ گیا ہے
تنگ آئی ہوئی خاموشی نے کہا
تم آپس میں مکالمہ کیوں نہیں کرتے
ہم اپنی اپنی انا سے نظر بچا کے
محبت کی علامت ڈھونڈنے بیٹھے
مگر رسّی سانپ بن چکی تھی
اور مکالے کی میز سے اُٹھتے ہی
ہمارے درمیان سے
محبت کا وہم ختم ہو چکا تھا!

❁❁

کاوش عباسی

میں کیوں برانگیختہ ہوں!

میں کیوں یوں برانگیختہ ہوں
ہمارا تعلق ہی کیا ہے
کبھی میری چاہت میں دل اس کا تڑپا
کبھی یاد میں میری آنکھ اس کی روئی
کبھی اگلے دن مجھ سے ملنے، مجھے دیکھنے کی
تمنا میں وہ رات بھر اپنے بستر میں جاگی
کبھی دیکھتے ہی مجھے ایسے مچلی
کہ جیسے امڈ کر بسا
مجھے چھونا، خود میں لینا ہی چاہتی ہو!
اگر اس کی سفاک باتوں نے اس کی جفا نے
مجھے آج بے طرح زخمی کیا ہے
تو پھر بھی عجب ہے مرا حال ایسا ہوا ہے
ہمارا تعلق ہی کیا ہے
وہ بھی بیسیوں ملنے والوں سا اک دوستانے کا دھوکہ
ہی ہے
ملنے والوں میں اتنا غبار، اتنا آزار ہوتا ہی ہے
کیوں میں اتنا برانگیختہ ہوں!
فدایانہ تڑپا ہوا ہوں!

❁❁

Address:
312 Mehran Apartment
Plot 12, ST-1, Bath Island
Clifton, KARACHI

صوفیہ انجم تاج

میرا کمرہ

میرا کمرہ
میرے بچپن کے سارے خلد منظر کو بجالے
اب بھی مجھ کو تک رہا ہے ایک دوری سے
جسے میں چھو نہیں سکتی
ہر ایک ریزے میں اس کے ہیں ہزاروں عکس
سارے عکس
یادوں کے جڑے ہیرے
دریچے نقری دھاگوں سے جھلمل
جس کے اندر ایک بوڑھی روشنی
عینک لگائے اجلے آنچل کے تلے مجھ کو
چھپا لینے کی دعوت روز دیتی ہے
مجھے بانہوں میں بھر لینے کو قصوں کا پرانا میٹھا لہجہ
قطرہ قطرہ
مجھ میں ایسے جذب کرتی ہے
کہ جیسے اس سے میری آشنائی مدتوں سے ہو
کسی ریشم گلی کا در کھلا کب ہے
کوئی دم اشک تھمتے ہی نہیں میرے
میں کیسے اس تلک جاؤں
میرا ٹھہرا سراپا اب
میدان میں تابوت بن کر گڑ گیا ہے، بے اثر ہو کر
جسے آندھی کے جھکڑ اور بارش تیز اولے
کڑکڑاتی بجلیوں کی
تیز آوازوں نے اور ان کے تھپیڑوں نے عجب
بے حال رکھا ہے
وہ کمرہ اب بھی تکتا ہے اسی دوری سے
کہ وہ میرے تصور کا تو بس اک چاند بن کر
آسماں پر اب
درخشاں ہے!

❁❁

Address:
1244 Millbrook Road
CANTON MI 48188 (U.S.A.)

صوفیہ انجم تاج

دھنک

پھر آج میرے تصور میں موتیا جاگا
پھر آج سبز پری اُتری جھمجھاتی ہوئی
پھر آج ڈالیاں پھولوں کی رقص کرنے لگیں
پھر آج خوشبوؤں سے بام و در مہکنے لگے
پھر آج پھیل گیا روح و دل میں سیل جمال
اثر نہ درد کا باقی رہا نہ غم کا خیال
پھر اٹھا چڑیوں کا اک جھنڈ چہچہاتا ہوا
ہوا ہرے بھرے کھیتوں سے اٹھی گاتی ہوئی
میں دیکھنے لگی سننے لگی نکھرنے لگی
چہکنے لگ گئی سجنے لگی سنورنے لگی
وہ میرا گاؤں کا گھر لال لال کھپرے کا
پھر اس کی اولتی سے ٹھنڈی دھار گرنے لگی
وہ ٹھنڈی دھار میری روح میں سمانے لگی
بھگونے لگ گئی مجھ کو
میں کھلکھلانے لگی!

❁❁

Address:
1244 Millbrook Road
CANTON MI 48188 (U.S.A.)

رخشندہ نوید

سانولی

'سے میری محبت کی ہوا تک چھو نہیں پائی
کبھی کھلتے گلابوں کی
اسے خوشبو نہیں بھائی
رہی اک عمر اس کے ساتھ
لیکن جان کب پائی
اسے رنگت سفید اور سرخی مائل اچھی لگتی تھی
اِدھر میں حسن کے کھلیان میں
رکھی ہوئی
گندم کی بالی تھی
ذرا سی سانولی تھی
اور اسے رنگت سفید اور سرخی مائل اچھی لگتی تھی!

❁❁

Address:

محمد مشتاق آثم

ایسا اگر ہوتا

تمہارے کان میں
کلکاریاں بجتی نہیں؟
چیخیں نہیں سنتے؟
لہو کا ذائقہ
اپنی زبانوں پر
تمہیں محسوس ہوتا ہے
فضا میں مُرتعش یہ خون اور بارود کی بدبو
تمہاری ناک تک پہنچی؟
تمہاری آنکھ مقتل میں
لہو کی نہر میں غلطاں
ہزاروں بے پردا
کومل، بجل، معصوم کلیاں
دیکھ کر روئی؟
نہیں
ایسا اگر ہوتا
تو ہر اک کو میسر
قبر اور تابوت ہو جاتا!

❁❁

Address:
10 EV-79
Opposite Jama Masjid
Wah Cantt.
(Punjab)

عامر سہیل

رنگِ آنجہانی [۱]

ازل سراؤں، ابد سراؤں کا پاک پانی
نشست گاہِ نشیب اور تمکنت پُرانی
جلو میں ابر و حجاب خدام آسمانی
حریم مشتاق میں گلابوں کو مہمانی
دیکھتے باغات اور جنات آندھیاں
اور ڈھکے ہوئے جو گیا جزیروں کے
چاک سیتا دبیز پانی!
بیا ہتا تارکول پر
چیلوں پہ جمتے لہو کا سند میں رائیگانی
ہزار پا سیپیوں پہ نیساں کو
آیتوں کی کتاب خوانی
دھرے تھے ازل پہ رنگ
اور کائنات کو سرمئی
رگوں میں بجھی کہانی
ازل سراؤں
ابد سراؤں کا پاک پانی

---

[۱] گل جی کے لیے

❁❁

Address:
220 Mahajir Colony
BAHAWAI NAGAR (Punjab)

یعقوب تصور

قطعات

نئے شالے دو شالے دیکھ لینا
یہ جھومر اور جھالے دیکھ لینا
تحائف جب نرالے دیکھ لینا
مرے ہاتھوں کے چھالے دیکھ لینا

✿

ہوا کے دوش پہ آئے شجر کو چھوڑ دیا
فضائے غیر میں آئے نگر کو چھوڑ دیا
تلاشِ رزق وسکوں، امن کی ضرورت نے
کیا کچھ ایسا پریشان گھر کو چھوڑ دیا

✿

فکر و تخیل، رُوح، تن پر دُھوپ
وسطِ صحرا ہر ایک منظر دھوپ
مرکزِ جاں سے تا بہ حدِ نظر
میں شجر ہوں میرا مقدر دھوپ

✿

تلاشِ رزق کے ارماں نکالتے گزری
حیات ریت سے سکے یہ ڈھالتے گزری
مسافرت کی صعوبت میں عمر بیت گئی
بچی تو پاؤں سے کانٹے نکالتے گزری

✿

طے کیے فاصلے سائے کی طلب میں لیکن
جسم سے دھوپ مسائل کی لپٹتی جائے
شمس کا قہرِ تمازت ہے مسلسل جاری
چادرِ زیست کہ ہر لمحہ سمٹتی جائے

✿

ضوٗ فشاں چہرۂ تقدیر کہاں کر پائے
جس قدر کرنا تھی تدبیر کہاں کر پائے
جہدِ تحصیلِ تمنا میں کٹی عمر تمام
پر کسی خواب کو تعبیر کہاں کر پائے

✿

یہ وقتِ ناروا ہے بہرحال کاٹنا
زنجیرِ دن کی رات کا ہے جال کاٹنا
اک ایک پل جدائی کا صدیوں پہ ہے محیط
اک لمحۂ وصال کو ہے سال کاٹنا

✿

الفاظ کو جذبات کا غماز نہ کرنا
اس شہر کا دستور ہے آواز نہ کرنا
جس کی نہ کوئی قدر ہو بازارِ طلب میں
سکہ کوئی بھی ایسا پس انداز نہ کرنا

Address:
Post Box # 4628, Abu Dhabi (U.A.E.)

بھگوان داس اعجاز

دوہے

ڈھونڈ رہا ہے تو کسے، سر پہ گٹھر ڈھوئے
نام دھام گھر کا پتہ، بی نہ فزں ہوئے

کاندھے لادے گھومتے، وہ اپنی ہی لاش
جو اوروں کی خامیاں کرتے رہے تلاش

عیب نہ اپنے جانتے، ہمہ پنوکس چوبند
جیسے ناک نہ سوجھتی، منہ پھیلی دُرگندھ

ہم دوسروں کی بھی ہو لازم رکھیے دھیان
اگر آپ سکھ چاہتے کم رکھیے سامان

اونچا اڑتے دیکھ کر، اڑیں نہ بہترے ہوش
تیرے من میں تھا حسد میرے من سنتوش

کامی مرتا کرودھ سے، دھن لوبھی کو کھائے
سنتوشی کے پیٹ میں وش امرت ہو جائے

سر کے بل چلتے سے اتنا رکھیے ہوش
سر پہ ٹوپی کی جگہ ہو پہنچتہ پاپوش

اک دوجے کے خون کے پیاسے ہیں شیطان
ہمسایے تھے دیوتا، کون بھر گیا کان

ایک سے تو بڑی بھی آنکھ بڑاتا جائے
سچ ہے آڑے وقت میں ہمسایہ کام آئے

❀❀

Address:
T-451, Baljit Nagar
New Delhi : 110008

پنچ بھجی

ایک سادھنا ہے لگن
ایک نہ ہوں ایندھن، اگن
عشق نہ چھوڑے چھاپ
بے عقلوں کے گانو میں
پائی بنے نہ بھاپ!

••

آئے نہ پت جھڑ آم پہ
ہوں میں دکھ سے پرے
کیا مٹی کیا سوم
میں شاعر ہوں اس لیے
تن پتھر من موم

••

لگے بھرم لو چھوٹتا
ڈھلتا سورج ڈوبتا
ٹوٹی من کی آس
آنے والی بھوری
کون کرے وشواس!

••

میں اس کا ہوں ادھر میں
کہیں گگن کے پار ہوں
کہیں بیچ پاتال
میرے چاروں اور ہے
تصویروں کا جال

••

وہ سنیاسی ہو گیا
خبر چھپی اخبار میں
تصویروں کے ساتھ
گھر اپنا اعجاز نے
پھونک دیا کل رات

••

شفق

مٹھی بھر آگ

اچانک تیز ہوا چلی تھی دیکھتے دیکھتے آسمان کالے بادلوں سے چھپ گیا اور بس اسٹاپ پر پہنچتے پہنچتے بارش نے آلیا۔

بس اسٹاپ سنسان پڑا تھا۔ شاید اس روٹ کی آخری بس بھی گزر چکی تھی، نیوایریا شہر سے دُور ہونے کی وجہ سے عموماً یہاں ٹیکسیاں یا آٹو بھی نہیں ملتے تھے اور اس طوفانی رات میں اُس کے اندر یہ ہمت بھی نہ تھی کہ ٹیکسی میں بیٹھے، مگر اسے گھر تو جانا ہی تھا۔ بارش تھمنے کے آثار نہیں تھے، تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پھواروں نے اسے شرابور کردیا تھا۔ بجلی کی لائن آنکھ مچولی کھیل رہی تھی، گھڑی بھر کے لیے آتی پھر گل ہوجاتی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کھڑی سمٹی سمٹائی وہ بارش کا زور طوفان کا قہر اور اژدہے کی طرح بڑھتی ہوئی رات۔

اُسے محسوس ہوتا کوئی دیو پیکر درندہ لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہے، اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگتی اور کھمبے کی اوٹ میں وہ خود کو سامنے محسوس کر کے کانپتی رہی مگر کبھی تو اس کا واہمہ ہوتا اور کبھی کوئی راہ گیر چھتری لگائے بغیر آگے آگے بڑھتا چلا جاتا۔

اُس نے کلائی پر بندھی ریڈیم ڈائل کی گھڑی دیکھی نو بجنے میں چند منٹ باقی تھے، یہ سوال اُسے مسلسل پریشان کر رہا تھا، کیا وہ ساری رات یہیں کھڑی بارش کے رُکنے اور کسی سواروں کے ملنے کا انتظار کرے گی؟

رات بڑھ رہی تھی، بارش بڑھ رہی تھی اور خوف بھی اگر وہ پیدل چلے تو کیا کئی میلوں کا سفر طے کر سکے گی؟ رات کے سناٹے میں شکار کی تلاش میں منڈلاتے عقاب...... ذہن کے اسکرین پر اخبار کی سرخیاں، معلوب چہرے اُبھرتے اور پھیل کر کہانی بن جاتے۔

تم نہیں جا سکوگی...... تم یہ راستہ نہیں طے کر سکوگی، اُس کے اندر کوئی مسلسل چیخ رہا تھا۔

اُس نے اپنے اندر چیخنے والے کو سمجھانے کی کوشش کی، اس بارش میں کوئی گھر سے کہاں نکلتا ہے شکاریوں کو بھی اپنی صحت کا خیال ہوتا ہے۔ وہ اگر کچھ راستہ طے کر کے آبادی تک پہنچ جائے تو کوئی سواری مل سکتی ہے۔

دور سے کار کی روشنی دیکھ کر وہ سڑک کی طرف دوڑی تھی۔ کار کے بریک چرچرائے اور وہ کھڑکی پر جھک پڑی۔

"مجھے ماڈل ٹاؤن جانا ہے کوئی سواری نہیں مل رہی ہے پلیز میری مدد کیجیے......."

اسٹیرنگ پر بیٹھے ہوئے شخص نے بغیر کچھ کہے پچھلا دروازہ کھول دیا اور وہ جلدی سے اندر گھس گئی۔

"میں نے آپ کو بہت تکلیف دی، آپ نہ جانے کہاں جا رہے تھے،" اس نے کھڑکی کا شیشہ چڑھاتے ہوئے کہا "آپ مجھے کسی ٹیکسی اسٹینڈ پر چھوڑ دیں آپ کا یہی احسان بہت ہے کہ......"

کار کے اندر کا بلب جلا تو وہ آگے کی طرف دیکھنے لگی۔

آسمان پر بادل زور سے گرجا تھا بجلی کہیں قریب ہی گری تھی، وہ جیسے شل ہو گئی، بڑی مشکل سے اس کے ہونٹوں سے نکلا "تم راحی۔" جواب میں ایک طویل قہقہہ سن کر اُس کا دل حلق میں آ گیا، اُس نے دروازہ کھولنا چاہا مگر کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور چھینٹے اُڑاتی تیزی سے بھاگنے لگی۔

کار کی رفتار سے بھی تیز اس کا ذہن اُڑ رہا تھا، اُس کی نظریں کھڑکی سے باہر اندھیرے میں بھٹک رہی تھیں۔

دو سال پہلے یونیورسٹی کا زمانہ البم میں لگی ہوئی تصویریں، ریتا، شبنم، منجو، رمیش اسلم اور راحش، راحش کے چہرے پر فونٹن پن سے داڑھی مونچھ اور پیچھے دم بنی ہوئی تھی ڈرامے کا ریہرسل اور راحش کی آنکھوں میں جلتی ہوئی قندیل، بہت کچھ سہتے ہوئے خاموش لب دور تک تعاقب کرتی نگاہیں۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اپنے باپ کی دولت میں اضافے کے لیے آگ اُگلتی زبان، تمہاری سوتیلی ماں اس کے لیے کافی نہیں کیا۔" زہر میں بجھے ہوئے قہقہے، "میں تم جیسے لوفر سے شادی کروں گی۔" رگوں میں بوند بوند اُترتا ہوا زہر"، اپنی دولت سے سب کچھ نہیں خرید سکتے، سمجھے؟۔"

درخت جھک کر زمین کو گلے لگانا چاہتا تھا مگر زمین کی نظروں میں ایسے کئی حادثے تھے، جب کوششیں رائیگاں گئی تھیں درخت کا تو کچھ نہیں بگڑا وہ پھر سیدھا کھڑا رہ گیا تھا مگر زمین داغ دار ہو گئی تھی۔ موسم بدلنے کے بعد، تیز بارش کے بعد بھی داغ نہیں گیا تھا۔ بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ اس درخت کو سخت ناپسند کرتی تھی اس کا جھکاؤ مشتبہ تھا اور نفرت میں اضافہ کا سبب بن رہا تھا۔

پھر البم کی تصویریں غائب ہو گئیں اور ٹوٹ کر برستے ہوئے پانی میں ایک کار تیزی سے دوڑ رہی تھی، کار میں بظاہر خموشی تھی مگر دو طوفان سر پٹخ رہے تھے۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"ارادہ تو افق کے اُس پار کا تھا مگر......"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی کار روک دو۔"

''اتنی رات گئے وہاں کیا کر رہی تھیں؟''

''تم کون ہو پوچھنے والے؟''

''کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ دو برس میں نے سو کر گذارے ہیں رمیش کہاں ہے؟''

اُسے لگا زمین کی پرت پھٹ کر اندر کا داغ نمایاں ہو گیا ہے۔ اُس نے ساڑی کا آنچل کس کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔

''میں کہتی ہوں گاڑی روکو۔''

''بہت دن گذرے شاید دو برس یا دو صدیاں''، وہ بہت نرمی سے بول رہا تھا۔ ''جب میں نے محسوس کیا کہ میں روبوٹ ہو گیا ہوں جیسے کہیں اور سے حرکت دی جاتی ہے مگر تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

وہ بھیگے ہوئے آنچل سے چہرے کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔

''اتنے دنوں بعد ملی ہو، کچھ باتیں کرو، تمہاری آواز ہر وقت کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ میری وہ تصویر تو تمہارے پاس ہوگی جس کے تم نے دم لگا دی تھی۔''

''تمہارا مقصد کیا ہے''؟ خوف کی ٹھنڈی لہریں اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھیں۔

''رمیش کے بعد ان دنوں کس سے......''

''شٹ اپ'' ......وہ اُبل پڑی اور وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ ''میں تو خود کو لعنت بھیج رہا تھا کہ ایسے موسم میں گھر سے کیوں نکلا مگر اب سوچتا ہوں کہ اگر نہ نکلتا تو......تم روز اس طرف آتی ہو؟''

وہ گاڑی سے باہر دیکھ رہی تھی گھٹا گوپ اندھیرا اور تیز بارش کا شور، کبھی کبھی بادلوں کی گرج اور نامعلوم منزل کی طرف دوڑتی ہوئی کار، دھیرے دھیرے چھائی جانے والی سوئیاں بدن میں دوڑتی ہوئی خوف کی لہر۔

''میں تمہیں ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں میری سوتیلی ماں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور میرے پتا کسی اسکول ماسٹر کی پڑھی لکھی لڑکی کی تلاش میں ہیں کیا تم '' کمینے ذلیل لوفر'' ......اُس کی چیخ کے ساتھ کار رُک گئی اور وہ پلٹ پڑا۔''

بچپن میں اس نے سپیروں کے پاس بڑے بڑے سانپ دیکھے تھے جن کی آنکھوں کی چمک اُسے اب تک یاد تھی۔

بھیگی ہوئی ساڑی بدن سے چپک کر اُسے برہنہ کیے ہوئے تھی پریشان زلفیں چہرے پر بکھری ہوئی تھیں اُس نے کار کا دروازہ کھولنا چاہا تو اُس کی کلائی پکڑ لی گئی۔

''کس کمینے ذلیل سے یہ توقع رکھتی ہو کہ وہ موقع سے فائدہ نہ اُٹھائے گا اور تم سے تو بہت سے حساب چکانے ہیں، بھاگ کر کہاں جاؤ گی دُور دُور تک جنگل ہے۔ میں نے تمہیں چاہا پیار کیا مگر تم نے کیا دیا، طعنے،

نفرت، ذلت، تمہارے قہقہوں کی گونج اب بھی میرے ذہن میں آگ لگا دیتی ہے، آج چپ کیوں ہو، لگاؤ قہقہہ خوب ہنسو مجھے چھوڑ دو کمینے ذلیل۔"

"جی بھر کے گالیاں دو، چیخو، یہاں تمہاری آواز سننے والا کوئی نہیں ہے" طوفان پھٹ پڑا تھا اور عتاب کے چنگل میں پھنسی ہوئی کبوتری خود کو بچانے کی جدوجہد کر رہی تھی درخت جھک کر زمین سے مل گیا تھا اور زمین سرک کر خود کو داغ دار ہونے سے بچانا چاہتی تھی۔ اس جدوجہد میں اس کا سر کٹر کی سے ٹکرایا۔ بادل گرجا تھا، بجلی چمکی تھی اور پھر اندھیرا بڑھتا ہوا اندھیرا۔

دوبارہ آنکھیں کھلیں تو آسمان میں تارے چمک رہے تھے طوفان گذر چکا تھا اور وہ اسٹیرنگ پر جھکا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔

وہ جلدی جلدی اپنے بے ترتیب کپڑے درست کرنے لگی، بلاؤز کے ہک بند کرتے ہوئے اُسے گریباں میں سختی کا احساس ہوا۔ اُس نے چھو کر دیکھا کئی نوٹ تہہ کیے رکھے ہوئے تھے اُس نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا اور انجان بنی ہک بند کرتی رہی سلوٹیں درست کرتی رہی۔

"میری منزل مل گئی اور تمہاری منزل بھی آ گئی ہے" اُس نے سگریٹ کا جلتا ہوا ٹکڑا باہر پھینک دیا۔

وہ ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

بارش میں بھیگے ہوئے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔

❁❁

Address:

سلطان جمیل نسیم

چارہ ساز

سیٹھ عباس کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل کر دیا گیا اور گھنٹہ بھر کے اندر شہر کے وہ تمام ڈاکٹر معائنہ کر گئے جو اپنے شعبہ کے ماہر تھے۔ معائنہ کیا کر گئے، سب اسپتال میں جمع ہو گئے اور سب اِس بات پر متفق بھی تھے کہ متعلقین نے نہایت بروقت فیصلہ کیا جو وقت ضائع کیے بغیر اسپتال لے آئے یوں فوری طبی امداد مل جانے سے وہ خطرہ ٹل گیا جو ایک ناگہانی آفت کی طرح گھر میں گھس آیا تھا۔ دو چار دن ICU میں رہیں گے اور جیسے ہی طبیعت سنبھل جائے گی، اسپیشل کمرہ میں منتقل کر دیا جائے گا۔ فی الحال احتیاط اور مستقل نگرانی کی ضرورت ہے۔

"What do you mean by NIGRANI" بڑے بیٹے کو انگریزی بولنے کا شوق تھا اُس نے فوراً ڈاکٹر سے سوال کر ڈالا۔

''ڈاکٹر صاحب کا مطلب ہے، Medical Supervision میں ابھی اباجی کو رہنا ہے'' چھوٹے بھائی نے جواب دیا اور تائید میں تقریباً سب ہی ڈاکٹروں نے گردن ہلا دی۔

دس پانچ منٹ ٹھہرنے کے بعد سب سے نامور ڈاکٹر سیٹھ عباس کے بیٹوں کے پاس آیا۔

''اللہ کا شکر ہے اب کسی قسم کی تشویش کی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر منصور یہاں موجود رہیں گے۔ ہم سب کے contact number اُن کے پاس ہیں۔ انشاء اللہ اب ضرورت تو نہیں رہے گی پھر بھی آپ جب ضرورت محسوس کریں۔ ڈاکٹر منصور، ہم میں سے کسی کو بھی کال کر لیں گے۔''

نجانے وہ کون سی گھڑی تھی کہ ڈاکٹر کی بات مان لی گئی۔

ڈاکٹر منصور جب اکیلے رہ گئے تو سیٹھ عباس کے گھر والے ان کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔

''کسی کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں۔ اچانک بیٹھے بٹھائے اندر ہی اندر ایک ایسا انقلاب اُٹھ کھڑا ہوگا کہ ہمیں اپنی دنیا تلپٹ ہوتی ہوئی نظر آنے لگے گی۔'' بڑے بیٹے نے کہا جو لاڈ پیار اور حالات کی وجہ سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر سکا تھا اس لیے وہ ثقافتی اور ادبی انجمنوں کی صدارت کے لیے بلایا جاتا اور سیٹھ عباس کی ہدایت کے مطابق لاکھ پچاس ہزار کی امداد نہیں بلکہ ''گرانٹ'' کا ضرور اعلان کرتا۔

''آپ نے تو دیکھا ہے ڈاکٹر صاحب۔ ظاہراً کوئی علامت ایسی نہیں۔ کھلاڑیوں کی طرح چھریرا بدن ہے، کھانے پینے سے زیادہ، دوسروں کو کھلا پلا کر خوش ہونے والے۔ مرغن غذاؤں کی طرف آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتے تھے۔ بس زندہ رہنے کے لیے ہلکے پھلکے کھانے۔ کہتے تھے، میرا بس چلے تو گاندھی جی کی طرح ایک

بکری پال لوں۔'' بیگم نے اتنا کہنے کے بعد دوپٹہ کے پلّو کو آنکھوں پر اس طرح رکھا کہ چہرہ چھپ گیا۔''جی ہاں ڈیڈی کے لیے کھانا کبھی مسئلہ نہیں رہا۔اُصول۔صحت کے اُصولوں پر ہمیشہ چلے۔صبح سویرے گھنٹہ بھر کی سیر پابندی کے ساتھ۔''

''مارننگ واک تو چھوڑتے ہی نہیں تھے۔اپنے ملک میں ہوں یا باہر Early to bed early to riseان کا اُصول رہا۔''

''ایک بار میں نے کہا ڈیڈی۔آج کل اغوا برائے تاوان کا موسم زوروں پر ہے اور آپ تڑکے ہی نکل جاتے ہیں......تو یہ سن کر ہنسے......اور پہلی بار ہم سے کہا......میں ہر مہینے تاوان پابندی سے دیتا ہوں......تم سب کی طرف سے بھی......میرے گھر کا کوئی فرد اغوا نہیں ہو سکتا بلکہ ایک طرح وہی لوگ گھر سے نکلتے ہی میرے باڈی گارڈ بن جاتے ہیں......''

''......He is genius"

''شراب تو دور کی چیز ہے انہوں نے کبھی پان سگریٹ کو منہ نہیں لگایا۔''

شوق البتہ ایک ہی رکھا......بزنس......مگر بزنس کو بھی کبھی جی کا جنجال نہیں بنایا۔''

''شطرنج کی طرح بہت سوچ سمجھ کر چال چلتے......اور مہارت اس بلا کی کہ کیا کہوں......کیمیا گر جیسے......مٹی کو بھی ہاتھ لگایا تو وہ سونا ہو گئی۔''

I think you can say it, luck and judgement

''لیکن یہ اچانک......عقل کام نہیں کرتی کہ ایسا کیوں ہوا؟'' کاروبار میں اعلا سوجھ بوجھ رکھنے والے بیٹے اور وفاق میں تجارت کی وزارت پر فائز داماد اپنی اپنی کہنے کے بعد دم بھر کے لیے رُکے تو بیگم نے بات کا سرا تھام لیا۔

''جب سے بچے بڑے ہوئے ہیں سارا کام ان کے سپرد کر دیا ہے۔ ہر ایک کو اس کا حصہ دے دیا......بچوں نے پوچھا......ڈیڈی آپ کیا کریں گے۔تو جواب دیا۔پہلے میں چھٹیاں مناؤں گا......تمہاری ماں کے ساتھ ورلڈ ٹور پہ جاؤں گا، پھر سوچوں گا کہ کیا کیا جائے......کل ہی تو ہمارے ٹکٹ آئے تھے......'' یہ کہتے کہتے ماں روہانسی ہوئیں تو پاس بیٹھے چھوٹے بیٹے نے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور کہا۔

Dont worry Mom you will go with Dad according to your plan

''انشاءاللہ''

منجھلے بیٹے نے ماں کا دھیان بٹانے یا باتوں میں اپنا حصہ لیتے ہوئے کہا''ایک بار ڈیڈی ہانگ کانگ اور سنگاپور گئے تھے، چار دن کا ٹور تھا، چار کام کی باتیں بتا گئے۔ مجھے یاد ہے ایک بات یہ تھی کہ آدمی دھوکا اُسی سے

کھاتا ہے جس پر بھروسہ کرتا ہے، کام پر نظر رکھو کام کرنے والے پر نہیں......"

"مجھے بھی یاد ہے انہوں نے کہا تھا۔ کام کرنے والے تو بہت مل جاتے ہیں اصل بات کام لینا ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ...... ڈاکٹر صاحب ہمیں ڈیڈی کا وے آف ٹریڈ ذرا اولڈ اسٹائلش لگتا تھا...... لیکن جب لبرٹی ملی تو ہم نے اپنے اسٹائل میں کام شروع کر دیا۔ Oh my my چار مہینے میں اتنا Ups Down بلکہ ڈاؤن ہی ڈاؤن...... ناٹ اونلی وِدمی...... ناٹ اونلی وِدمی...... سب کے ساتھ اور تو اور ہمارے منسٹر صاحب کے ساتھ بھی اِن کو کسی Religious ministry میں لگا دیا گیا...... ہم لوگ تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے...... جب ڈیڈ آئے تو ہم لوگ اُن کے سامنے اپنی ناکامیوں کے چارٹ...... ہنس ہنس کے سب کی باتیں سنتے رہے...... پھر Very Next day سب ٹھیک ہوتا چلا گیا۔"

وفاقی وزیر نے مسکراتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ہمارے ڈیڈ گریٹ پلانر ہیں...... ان کا ججمنٹ ان کی Prediction اتنی Correct ہوتی ہیں کہ "Nobody can imagine" "مارننگ واک کرنے والے اور شام کو گاف کھیلنے والے ڈیڈ اور اتنا SEVERE ہارٹ اٹیک......"

"یہ خیال تو کبھی ہمارے دل سے گزرا بھی نہیں تھا۔"

"صبح ٹہل کر آئے۔ آنے کے بعد غسل کیا۔ فجر کی نماز پڑھی اور معمول کے مطابق ناشتے کی میز پر آن بیٹھے" بیگم نے کہا۔

گھر والوں کی یہ ساری باتیں بالکل درست تھیں۔ سیٹھ عباس جب ناشتے کی میز پر آ کے بیٹھے تو سامنے پڑے ہوئے اخباروں میں سے ایک انگریزی اخبار کا تجارتی صفحہ نکال کے ذرا توجہ کے ساتھ دیکھتے رہے۔ پھر بڑے بیٹے سے کہا،

"یارن امپورٹ کرو کاٹن کا فارورڈ میں سودا کر لو۔ اپنی پروڈکشن جتنی بڑھا سکتے ہو بڑھاؤ۔ ڈبل شفٹ میں کام کرو۔ دو مہینے کے اندر مارکیٹ اوپر جانا چاہیے۔"

یہی جملہ ادا ہوا تھا کہ ایک دم کپکپی سی طاری ہوئی اخبار ہاتھ سے پھسل گیا۔ کنڈے کے ساتھ انگلی میں اٹکی ہوئی چائے کی پیالی۔

سردی میں بجتے دانتوں کی طرح پرچ سے ٹکرا کے کٹا کٹ کٹا کٹ کی آواز پیدا کرنے لگی اور اِس سے پہلے کہ میز کے گرد بیٹھے ہوئے بال بچے پوری طرح صورتِ حال کا اندازہ کر سکیں وہ کرسی پر ایک جانب ڈھلک گئے۔

اسپتال لے جائے گئے تو وہاں مختلف شعبوں کے ڈاکٹر پہلے سے موجود تھے، جو نہیں بھی تھا، وہ دس پانچ منٹ میں پہنچ گیا۔

ساتھ آنے والوں کی گھبراہٹ دیکھ کر کسی نے کہا۔ "دُعا کیجیے"

دُعا کا لفظ گولی کی طرح لگا۔ کہنے والے کی جانب ایسی خشمگیں نگاہوں سے دیکھا گیا جیسے اُس نے بد عادی ہو جب تمام ماہر ڈاکٹروں نے اطمینان دلا دیا اور ڈاکٹر منصور کو لواحقین کے سپرد کر کے چلے گئے۔ اُس وقت بڑے بیٹے کا دوست اسپتال پہنچا۔ ساری صورتِ حال معلوم کر کے اس نے سرگوشی کی۔

"ذرا باہر آؤ۔"

باہر لے جا کے اُس نے کہا۔ "بھئی مجھے یہاں کے ڈاکٹروں پر بھروسہ نہیں ہے...... میری بہن کا کیس بگاڑ دیا تھا کھول کے بیٹھ گئے...... وہ خوب ہنسے اسی اسپتال میں...... تمہیں تو معلوم ہی ہے۔ امریکہ میں ایک ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر اسٹیوارٹ...... وہ شکاگو کے اسپتال میں ہے۔ مصروف بہت ہے مگر ماہر ایسا کہ اِدھر نبض پر انگلی رکھی اُدھر رُکا ہوا دل دھڑکنے لگا۔ میں اپنی بہن کو وہاں لے گیا تھا...... اگر ہو سکے تو اسے بلوالو......"

"What do you mean! اگر ہو سکے تو...... میں ابھی فون کرتا ہوں"

بڑے بیٹے نے منجھلے سے کہا "یہ ڈاکٹر اسٹیوارٹ کا فون نمبر ہے۔ ان سے کہو فی الفور آجائیں۔"

وفاقی وزیر نے کہا "میں ابھی پاکستان ایمبیسی فون کراتا ہوں...... وہ اُس ڈاکٹر...... کیا نام ہے اُس کا......؟"

"آپ رہنے دیجیے بھائی جان۔ ہم ابھی Arrange کیے لیتے ہیں"

بڑے بیٹے کے دوست نے یہ بات پھر بتائی کہ ڈاکٹر اسٹیوارٹ جواں سال ہیں لیکن اللہ نے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ اسی سبب سے شہرت اور دولت کی ریل پیل نے مصروف ترین ڈاکٹر بنا دیا ہے۔

دو تین گھنٹہ کوشش کے بعد ڈاکٹر اسٹیوارٹ کی سیکریٹری سے بات ہو سکی۔ اس نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ اُن کے بے شمار اپائنٹمنٹس ہیں وہ نہیں آسکتے۔ ہاں اگر مریض کو یہاں لے آئیں تو ایک ہفتہ کے اندر وقت ملنے کی اُمید ہو سکتی ہے۔

سیٹھ عباس کے منجھلے بیٹے نے دوبارہ کال ملائی اور اس مرتبہ ڈاکٹر کی سیکریٹری سے بات کرنے کے بجائے اپنے دوست سے بات کی۔

"ڈاکٹر اسٹیوارٹ کو آج ہی یہاں بھیجنے کا انتظام کرو۔ ہر قیمت پر...... میرے ڈیڈ کی زندگی سے زیادہ قیمتی کوئی نہیں ہے۔"

پانچ چھ گھنٹے بعد دوست کا ٹیلی فون آیا۔ وہ ساری تفصیل غیر ضروری سمجھ کے نظر انداز کر دی گئی کہ ڈاکٹر کو کیسے اور کتنی فیس دے کر آنے پر رضامند کیا گیا۔ کیسے جہاز کا ٹکٹ حاصل کیا۔ سیٹ کی کنفرمیشن میں کیا کیا کشٹ اُٹھانے پڑے۔ گفتگو کا حاصل...... ائرلائن کا نام اور فلائٹ نمبر نوٹ کر لیا گیا۔

ڈاکٹر اسٹیوارٹ کے آنے کا سن کر سب کے چہروں پر رونق آ گئی۔

سیٹھ عباس انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھے۔ اُن کی بیگم نے مشورہ دیا کہ اسپتال میں ڈاکٹر اور دوائیں تو موجود ہیں، اللہ نے چاہا تو کل شام تک امریکی ڈاکٹر بھی آجائے گا...... کچھ صدقہ خیرات بھی دے دیا جائے۔ ماں کے منہ سے بات نکلنے کی دیر تھی۔ نوکروں کو دوڑا دیا گیا کہ شہر کے سب یتیم خانوں میں پکے پکائے کھانے کی دیگیں پہنچادی جائیں۔ مدرسوں میں صدقہ، خیرات کی رقم دے کر کہا جائے کہ یٰسین شریف اور ''یا سلامو'' کا ختم کرا دیا جائے۔

ماں نے اور عباس سیٹھ کی بیٹی نے گھر سے تسبیح منگالی تھیں۔ خود بھی درود وظائف تسبیح کے دانوں پر ورد کر رہی تھیں۔ امراء و وزراء کی جن خواتین تک خبر پہنچ گئی تھی وہ آتو گئی تھیں مگر تسبیح ساتھ نہ لاسکی تھیں اس لیے ہونٹ انگلیوں کے اشارے پر چل رہے۔ شہر بھر کے ڈاکٹر جب بھی فرصت پاتے آ کے سیٹھ عباس کو دیکھتے اور متعلقین کو اطمینان دلاتے کہ ماشاء اللہ اب سیٹھ صاحب کی طبیعت سنبھل رہی ہے۔ لیکن کسی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ دروازے کے شیشے میں سے سب جھانک جھانک کر دیکھتے...... اور اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے دوسروں کو تسلی دیتے۔

تیسرے دن شام کو ڈاکٹر اسٹیوارٹ کو پہنچنا تھا...... شہر کے فائیو اسٹار ہوٹل میں سوئٹ بک کرادیا گیا تھا اور دوپہر ہی سے دو گاڑیاں انہیں لینے کے لیے ائرپورٹ روانہ کردی گئی تھیں۔

ڈاکٹر اسٹیوارٹ کا جہاز ابھی پاکستانی فضاؤں میں پہنچا بھی نہیں تھا کہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ سے ایک ڈاکٹر باہر آیا اور بڑے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

''مبارک ہو۔ سیٹھ صاحب اب خطرے سے باہر ہیں۔ آپ میں سے کوئی ایک ان سے جاکے مل سکتا ہے۔ لیکن زیادہ باتیں نہ کی جائیں۔''

بیٹے کو دیکھتے ہی سیٹھ عباس کے ہونٹوں پر ہلکی سے مسکراہٹ پھیلی پھر بہت ہی نحیف آواز میں بولے۔

''یار یہ مجھے کہاں لا کے باندھ دیا ہے...... نکالو یہاں سے۔ دم گھٹتا ہے۔''

بیٹے نے باپ کا ہاتھ محبت سے دبایا اور تشویش بھری نظر ڈاکٹر کی طرف ڈالی...... اُس نے فوراً کہا۔

''آپ فکر نہ کیجیے دو تین گھنٹے بعد روم میں شفٹ کرانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ لیکن وہاں ان کے پاس زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ ہو۔ اور یہ زیادہ باتیں نہ کریں۔''

✿

سیٹھ عباس کو جس وقت ICU سے V VIP روم میں شفٹ کیا جا رہا تھا عین اسی وقت ایک دوسرا مریض ICU میں داخل ہو رہا تھا۔

وہ دوسرا مریض۔ ڈاکٹر اسٹیوارٹ تھا جس پر جہاز میں ہی دل کا دورہ پڑا تھا۔

Address:

✿✿

طاہر نقوی

موسم

میں کیتھرین کے رویے سے پریشان تھا۔ وہ کئی روز سے مجھے کہیں نہیں ملی تھی۔ اس کے موبائل پر کوئی جواب نہ ملا تو میں اس کے اپارٹمنٹ جا پہنچا۔ کئی بار اطلاعی گھنٹی دینے کے باوجود دروازہ نہ کھلا۔ پھر پتہ چلا کہ وہ اپنے آفس بھی نہیں جا رہی۔ اس کے متعلق کسی کو کوئی علم نہ تھا۔ میری بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی سوچ میں گم میں اس ریسٹوران کی طرف جانے لگا جہاں ہم دونوں بیٹھا کرتے تھے۔ وہاں پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ دروازے پر لگی تختی پر درج تھا۔

"Muslims and Dogs - Not Allowed"

میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ وہاں سے پلٹا تو سامنے والی فٹ پاتھ پر نظر پڑتے ہی میری ساری کیفیت بدل گئی۔ کیتھرین سپر اسٹور سے نکل کر ایک طرف جا رہی تھی۔ میں نے دوڑ کر سڑک عبور کی اور اس کے قریب جا پہنچا۔ وہ مجھ سے کترا کر نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر میں نے راستہ روک لیا۔

''اس رویے کا مطلب؟''

کسی جواب کے بجائے اس کے چہرے پر ناگواری کا گہرا تاثر آیا۔ میں نے اس کا شانہ تھام کر پوچھا۔

''بتاتیں کیوں نہیں؟''

اس نے نفرت سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

''تمہیں جواب دینے کی پابند نہیں''

''تم تو میرے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھیں۔ مجھ سے شادی کیلئے اپنا مذہب تبدیل کرنے کا دعویٰ کرتی تھیں۔''

''یہ اس وقت کی بات تھی''

''اب ایسا کیا ہو گیا''

''یو مسلم'' وہ حقارت سے دھاڑی اور آگے بڑھ گئی۔

میں کھڑا اسے تکتا رہا۔ اتنی تیزی سے تبدیلی پر میں حیرت زدہ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا وقت سے پہلے پت جھڑ شروع ہو گیا ہو۔

ویک اینڈ کے بعد اپنے آفس پہنچا تو مجھے ملازمت سے علیحدگی کا آرڈر تھما دیا گیا۔ کئی برسوں کی رفاقت کے باوجود میرے ساتھیوں کی آنکھوں سے بے رحم لاتعلقی جھانک رہی تھی ان کے مخالفانہ خیال اور عمل کے درمیان کوئی

فاصلہ نہیں رہا تھا۔ آنے والے دن میرے لیے تاریک تھے۔ کوئی شخص میری کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ میں نے اپنی انا کو تھپکی دے کر سلانے کی کوشش کی اور کیتھرین سے رابطہ کرنے کی ٹھانی۔ تا کہ وہ میرے منیجر سے میری ملازمت کی بحالی کے لیے بات کرلے۔ میرے منیجر سے اس کے اچھے مراسم تھے۔ چنانچہ میں نے اس کے موبائل کا نمبر ملایا۔ میری توقع کے برعکس اس کی آواز سنائی دی۔ شاید اس نے بے خیالی میں فون سن لیا تھا۔ میری آواز سن کر رعونت سے بولی۔

''تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے؟''

''میرے بس میں ہو۔ تب۔ نا!''

''میں تم سے نہیں ملنا چاہتی۔''

''مجھ سے محبت کرتی تھیں تم'' میرا لہجہ خوشامدانہ تھا۔

''ہاں۔ اب نفرت کرتی ہوں۔''

''کیتھرین۔ مجھے نوکری سے بھی نکال دیا گیا ہے''

''مجھے پتہ ہے''

''تو میرے منیجر سے سفارش......''

میری مکمل بات سنے بغیر اس نے فون بند کردیا۔ میں سر تھام کر رہ گیا۔ میں نے اپنے دوستوں جانسن اور رچرڈ سے مدد مانگی۔ انہوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ میرے سارے لفظ بے اثر ہو گئے تھے۔ مسلمان جان پہچان والے خود ایسے ہی مسائل سے دوچار تھے۔ مجھے دور دور کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ درخت پر لگا ہوا تنہا پتا جیسے تیز ہوا سے لرزنے لگتا ہے۔ وہی کیفیت میری تھی۔

میرے پاس جو جمع پونجی تھی، اسی پر گزر بسر تھی۔ دراصل میں پڑھنے کے لیے امریکہ کی ایک یونیورسٹی آیا تھا۔ کیتھرین دو برس میری کلاس فیلو رہی پھر یہ دوستی محبت میں تبدیل ہوتی گئی۔ اس دوران میں عارضی ملازمت کرتا رہا۔

میں کیتھرین کو کسی طرح اپنے دل سے نہیں نکال پا رہا تھا۔ اس کے لیے ہر لمحے بے چین رہتا۔ چنانچہ بے اختیاری طور پر ایک شام اس کے فلیٹ پر جا پہنچا۔ اطلاعی گھنٹی بجا کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔ شاید اس نے مجھے میجک آئی سے دیکھ لیا تھا۔ میں مایوس ہو کر پلٹ آیا اور دیر تک سڑکوں پر ٹہلتا رہا۔ میری ہیجانی کیفیت روز بروز شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ اگر کیتھرین سے ملاقات نہیں ہوئی تو میں لمحہ لمحہ ختم ہو جاؤں گا۔ مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ ایک پبلک ٹیلی فون سے اس کا نمبر ملایا۔ اس کی آواز سن کر میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔

''کیتھرین۔''

''آئی ہیٹ یو۔''

''پلیز میری ایک بات سن لو''

''بولو''اس نے سرد مہری سے پوچھا۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں''

''تمہیں یہ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی''

''تم خود بھی یہی چاہتی تھیں۔''

''شٹ اَپ''

''تمہاری خاطر اپنا مذہب چھوڑ دوں گا۔''

''تب بھی اندر سے مسلم ہی رہو گے''اس نے سفاکی سے طنز کیا۔

''نہیں۔میرا اعتبار کرو۔''

اب وہ چپ رہی تو میری ہمت بڑھی۔میں نے اپنے من کی بات کہہ دی۔

''کل دونوں گرجا جا کر شادی کرلیں گے۔''

اس نے چند لمحے توقف کے بعد ہنکاری بھری اور فون بند کردیا۔مجھے یہی لگتا تھا کہ کیتھرین کا دل اب میری طرف سے پسیج گیا ہے۔اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لیے میں اگلے روز اس کے اپارٹمنٹ جا پہنچا۔اطلاعی گھنٹی پر دروازہ کھلا اور وہ مسکراتے ہوئے نمودار ہوئی۔حسب سابق اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔یہ سب دیکھ کر مجھے پختہ یقین ہوگیا کہ اسے میری سچی محبت نے اب مجبور کردیا۔میں نے بے قرار ہو کر کہا۔

''اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

وہ اُٹھ کر چلی گئی۔میں اپنے دل خوش کن خیالوں کی طرف نکل گیا۔اسی لمحے دروازے کی اطلاعی گھنٹی چیخی۔ کیتھرین نے جلدی سے دروازہ کھولا۔دو تین پولیس مین داخل ہوئے۔کیتھرین نے انہیں نفرت سے بتایا۔

''یہی شخص ہے جس نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے''

یہ سن کر میں کانپ کر رہ گیا۔لگتا تھا جیسے ہر واقعہ کسی رمز سے جڑا ہوا ہو۔پولیس والے مجھے گرفتار کر کے لے جانے لگے تو میں نے احتجاج کیا۔

''میرا قصور......؟''

پولیس والوں کے بجائے کیتھرین نے جواب دیا۔

''کیا یہ کم ہے کہ تم مسلم ہو''

''مگر یہ میرا جرم کیوں ٹھہرا؟''

Address:
GPO Box # 111090,
Gulshan-e-Iqbal GPO
Karachi : 75850

❁❁

عذرا نقوی

انتم سنسکار

ڈیوڑھی نما بڑے دروازے میں داخل ہو کر بیری والا باغ محلہ شروع ہوتا تھا، جہاں پھوپی جان کا گھر تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی بیچ کی نسبتاً چوڑی گلی سے دائیں بائیں پتلی پتلی گلیاں نکلتی تھیں، جہاں پُرانے مکان تھے جو مسلمان پاکستان جاتے وقت چھوڑ گئے تھے اور ان میں مغربی پنجاب سے آئے ہوئے خاندان بس گئے تھے۔ لیکن اب بھی اس محلے میں کچھ مسلمان خاندان آباد تھے۔ پھوپھا جو شفیق میموریل اسکول میں اُستاد تھے انہوں نے شاید سن اڑتالیس میں، یہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ نہ جانے کس سے لیا ہوگا، میں گھر میں داخل ہوتے ہوئے سوچنے لگی۔

پھوپھی جان کے گھر کا آنگن ہمیشہ کی طرح صاف ستھرا تھا۔ حالانکہ فرش کے پُرانے سرخ پتھر کئی جگہ ٹوٹ گئے تھے۔ آنگن میں دروازے کے ساتھ باہر والی بیٹھک تھی جس کے دو دروازے باہر گلی میں کھلتے تھے اور ایک دروازہ اندر گھر میں کھلتا تھا۔ بیٹھک کے پُرانے لکڑی کے کواڑوں کے اوپری حصے میں رنگ برنگے شیشے لگے ہوئے تھے، جن میں کچھ ٹوٹ گئے تھے اور ان کی جگہ پلائی کے ٹکڑے جڑ دیے گئے تھے۔ آنگن کے اس پار بیٹھک کے مقابل لمبا برآمدہ تھا۔ برآمدے کے بعد لمبی سہ دری تھی جس کو ایک اینٹ کی دیوار سے کمروں کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک زینہ آنگن سے اُوپر جاتا تھا جہاں پھوپھی جان کے بیٹے اکبر بھائی رہتے تھے جو ہندو کالج میں زولوجی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر تھے۔

''آداب پھوپھی جان'' میں نے آنگن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے آج میرا دل کہہ رہا تھا کہ کوئی آئے گا ضرور۔'' انہوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا، ''بے مروّت، آ گئی پھوپھو کی یاد۔ دلی میں ہی رہتی ہو اور مہینوں ہو جاتے ہیں شکل دیکھے ہوئے۔''

''کون آیا ہے بتول؟'' کمرے کے اندر سے دادا ابا کی بھاری آواز آئی۔ چق اُٹھا کر اندر گئی تو وہ حسبِ معمول تخت پر سفید گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے سفید ململ کا کرتا اور سفید آڑا پاجامہ پہنے۔ سرہانے نہج البلاغہ، دیوان میر چند اور کتابیں اور اُردو کا اخبار رکھا ہوا تھا۔

''تصویر زہرا آئی ہے بابا۔'' پھوپھی جان نے کہا اُونچی آواز میں کہا کیونکہ دادا اب بہت اُونچا سننے لگے تھے۔ میرا پورا نام تو صرف پھوپھی جان ہی لیتی ہیں۔ ورنہ سب تصویر کہتے ہیں یا یونیورسٹی میں زہرا کہلاتی ہوں۔ دادا ابا نے میری تاریخ پیدائش کے حساب سے یہ نام رکھا تھا۔

پھوپھی جان نے پھر قدرے نیچی آواز میں کہا: ''اے ہے! ابھی امام کا چہلم بھی نہ ہوا اور تم نے لال ساڑی پہن لی۔ اور پھر یہ ساڑھی پہننے کہ کیا مار ہے۔ بن بیاہی لڑکیاں نہیں اچھی لگتیں ساڑی پہنے۔ ویسے بھی غیروں کا پہناوا۔''

کہاں تو دادا جان اُونچا سنتے ہیں کہاں انہوں نے سب کچھ سن لیا۔

ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''وہ شکست خوردہ شاہیں جو پلا ہو کر گسوں میں......''

محلے میں داخل ہوتے ہی میں نے ماتھے کی بندی تو اُتار کر پرس میں رکھ لی تھی۔ ویسے ہی شوق میں لگالی تھی ساڑی سے میچ کرتی ہوئی بندی اور یہ ساڑھی لال بھی تو نہیں، کافی گہری عنابی ہے۔ میں نے سوچا۔ دراصل میں سیدھی ایک سیمینار سے اِدھر آ گئی جو حقوق نسواں اور اقلیتوں کے موضوع پر سینٹ اسٹفن کالج میں کیا گیا تھا۔

پھوپھا جان جو اسکول سے آ گئے تھے اور پلنگ پر بیٹھے جوتے کے فیتے کھول رہے تھے۔ انہوں نے بھی پھوپھو کے اعتراض سن لیے، وہ ہنس کر بولے۔

''تصویر۔ تمہاری پھوپھی جان کا بس چلے تو سارے سال سوگ منایا کریں۔ ڈھائی مہینے محرم، چہلم کا سوگ اور پھر رمضان کے مہینے پھر بھی کوئی ریڈیو یا ٹی وی پر گانا نہیں سن سکتا۔''

''اچھا بس اپنی کامریڈی مت بگھاریے، میں اپنی بیٹی سے بات کر رہی ہوں۔'' پھوپھو کہتی ہوئی کھانا نکالنے چل دیں۔

کوفتے پکے تھے کھانا کھا کر مزہ آ گیا، ورنہ ہاسٹل میں تو دال، سبزی ہی کھاتی تھی۔ نان ویجیٹرین اس لیے نہیں لیتی تھی کہ پتہ نہیں گوشت حلال ہے یا جھٹکے کا۔

کھانا کھا کر برآمدے میں بچھی مسہری پر پھوپھی جان کے ساتھ لیٹ کر باتیں کرنے لگی تو کچھ دیر کے لیے آنکھ لگ گئی ہوگی۔ کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز سے آنکھ کھلی تو دیکھا اوپر کوٹھے والے مکان سے شکنتلا بہن جی اپنی دیوار پر سر نکالے پھوپھی جان سے پوچھ رہی تھیں۔

''بتول بہن جی۔ تصویر آئی ہے، اس کی آواز جیسی لگ رہی تھی۔ پنکی بھی آج سسرال سے آئی ہے، پوچھ رہی تھی اپنی بچپن کی سہیلی کو'' اتنی دیر میں پنکی بھی دیوار سے جھانکنے لگی۔ پھوپھی جان نے چلا کر کہا۔ ''اے ہے! پنکی کیا کرتی ہو، ایسی حالت میں تم کیوں اسٹول پر چڑھ گئیں...... یا علی، یا علی سنبھل کے......، اُترو نیچے...... میں تصویر کو بھیج دوں گی دومنٹ کے لیے تمہارے گھر۔''

مجھے ہنسی آ گئی اس دومنٹ والی بات پر۔ جب ہم بچپن میں پھوپھی جان کے گھر کبھی چھٹیوں میں جاتے تھے اور پنکی کے گھر کھیلنے کے لیے جانا چاہتے تھے تو پھوپھی بس تھوڑی دیر کی اجازت دیتی تھیں۔ کچھ کھانے پینے کی

ممانعت کر دیتی تھیں مگر مانتا کون تھا۔ شکنتلا بہن جی کے ہاتھ کے مولی کے پراٹھے کون چھوڑ سکتا ہے۔ کونڈوں کے نیاز کی میٹھی ٹکیاں جب پھوپھی جان آنگن میں انگیٹھی رکھ کر پکاتیں تو بے بی اور پنکی میرے ساتھ اکڑوں بیٹھ کر بہت دلچسپی سے دیکھتی تھیں۔ پھوپھی جان کو فکر لگی رہتی کہ کہیں وہ ان کے پاک کیے ہوئے برتنوں کو نہ چھولیں۔ نیاز سے پہلے وہ کچھ پوریاں پنکی اور بے بی کو بھی دیتی تھیں۔

میں پنکی سے بات ہی کر رہی تھی کہ اکبر بھائی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے، انہوں نے پھوپھا کو الگ لے جا کر کچھ کہا، وہ سر پکڑ کر آنگن میں رکھی نماز کی چوکی پر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے پھوپھی جان سے کچھ کہا تو وہ سینے پر دوہتڑ مار کر مسہری پر گر پڑیں۔ دادا جان باہر نکل آئے تو اکبر بھائی نے رک رک کر بتایا کہ نسیمہ پھوپھی کا فون آیا تھا، ان کی بیٹی سیما جو دلی کے ایک NGO میں سوشل ورکر تھی وہ ایکسیڈنٹ میں ختم ہوگئی۔ اس کی آخری رسومات یہیں ادا ہوں گی۔

نسیمہ پھوپھی ہمارے ابا کی خالہ زاد بہن تھیں۔ اپنے زمانے میں بہت انقلابی تھیں، لکھنؤ میں پڑھتی تھیں تب انہوں نے اپنے ایک کامریڈ ساتھی امریش سنگھ سے شادی کی تھی۔ سیما سے میں دو سال پہلے ملی تھی، وہ مجھ سے دو چار سال بڑی ہوگی۔ بہت پیاری لڑکی تھی، بہت شوق سے سوشل ورک میں ڈپلوما لیا تھا اور اب جی جان سے اپنے کام میں لگی رہتی تھی۔ سیما اپنی ایک دوست دیپالی کے ساتھ ایک کرائے کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ جب سیما کو دہلی میں ملازمت ملی تھی تب نسیمہ پھوپھی ایک بار پھوپھی جان کے گھر اس کو ساتھ لے کر آئی تھیں اور اس کو تاکید کی تھی کہ وہ یہاں آتی رہے۔ وہ پھوپھا سے کہہ گئی تھیں کہ سیما کی خیر خبر رکھیں۔

اکبر بھائی اور پھوپھا عجلت سے باہر نکل گئے، پھوپھی کچن کے برابر والے چھوٹے کمرے کا سامان نکالنے لگیں اور مجھے بھی مدد کے لیے بلا لیا، اس کمرے میں غسل دینا تھا۔ مغرب کے وقت سے گھر میں خواتین اور باہر بیٹھک میں مرد آنے شروع ہوگئے۔ پھوپھا، سفید کپڑے کا پلندہ اور اور دیگر سامان پھوپھو کو دینے گھر میں آئے تو بتایا کہ نسیمہ پھوپھو لاش کے ساتھ ایک گھنٹے بعد پہنچ جائیں گی وہ صبح ہی لکھنؤ سے آچکی ہیں۔

امریش انکل کا انتقال ہوئے دس برس گذر گئے اور ان کا بیٹا امریکہ جا کر بس گیا۔ نسیمہ پھوپھی لکھنؤ میں اپنے آبائی مکان میں اپنے ایک بھتیجے کے ساتھ رہتی ہیں وہ بھی دو برس سے سعودی عرب گیا ہوا ہے۔ لکھنؤ میں وہ آج کل بالکل اکیلی ہیں۔ یہ سب کچھ پھوپھی نے کام کے دوران مجھے ابھی ابھی بتایا تھا۔

میں نے زندگی میں پہلی بار یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھوپھو چٹائی بچھا کر کچھ خواتین کے ساتھ کفن تیار کرنے لگیں۔

برآمدے میں ایک بزرگ خاتون جو ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھی تھیں، انہوں نے قریب بیٹھی مسز تقوی سے کہا ”سنا ہے کہ مرنے والی کا باپ ہندو تھا، وہ بھی ہندو ہی ہوگی؟“

مسز تقوی نے منہ بنا کر دھیرے سے کہا" ارے، ان لوگوں کا کیا مذہب، ماں ممی باپ کلنگ، بچے اپنے اپنے رنگ۔"

ایک اور خاتون نے کہا سیپارے کا ورق پلٹتے ہوئے کہا" ہم تو بس مغفرت کی دعا کر رہے ہیں، آگے اللہ جانے۔"

نسیمہ پھوپھو جوگٹھیا کی مریض تھیں، سکتے کی حالت میں دروازے میں داخل ہوئیں، ان کے پیچھے لاش لے کر اکبر بھائی اور کچھ لوگ تھے۔ پھوپھی جان نے انہیں سنبھالا اور کچھ خواتین نے غسل دینے کی تیاری شروع کردی۔

ابھی غسل ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک باہر بیٹھک میں کچھ ہل چل سی ہوئی، کچھ تیز تیز آوازیں سنائی دیں۔

شمشان گھاٹ......ارتھی...... انتم سنسکار......کچھ ایسے الفاظ سنائی دیے۔

پھوپھا گھبرائے ہوئے اندر آئے اور دھیرے سے پھوپھی جان سے کہا کہ سیما کے ددھیال والے آئے ہیں۔ خواتین میں بے چینی سی پھیل گئی۔ نسیمہ پھوپھی تو بالکل سکتے کی حالت میں تھیں۔ پھوپھی جان دل پکڑ کا بیٹھ گئیں۔

غسل مکمل ہو چکا تھا، آنگن میں میت میں لا کر رکھی جا رہی تھی، کافور کی بو پھیلی ہوئی تھی، نسیمہ پھوپھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ باہر مردانے میں اب بھی تیز تیز بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اتنے میں ایک لڑکی تیزی سے اندر آئی، یہ دیپالی تھی سیما کی دوست، اکبر بھائی نے بتایا۔

اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے جو اس نے پھوپھا کے ہاتھ میں تھما دیے۔

پھوپھا نے چند منٹ کاغذات دیکھے، چند منٹ کے لیے آنکھیں بند کر کے کھڑے رہے پھر گہری سانس لے کر کہا" سیما نے اپنی ڈیڈ باڈی میڈیکل ریسرچ کے لیے دینے کا فیصلہ کئی سال پہلے ہی کر لیا تھا۔"

نسیمہ خالہ چیخ مار کر روئیں، سیما کی لاش سے لپٹ کر اُسے چومنے لگیں۔

میں نے نہ جانے کیوں چین کا سانس لیا۔

❁❁

Address:

C/o Dr. Pervez Ahmed
King Sand University
Post Box # 1178, RIYADH - 11543
(K.S.A.)

شاکر انور

پرندے

وہ نڈھال سا بستر پر گر گیا۔ اس کی پیشانی کے بائیں جانب کی رگیں درد کی شدت سے اُبھر گئی تھیں، جسے وہ اپنے انگوٹھے سے دباتا رہا اور صوفیہ کا انتظار کرتا رہا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ صوفیہ بھی نہیں آئے گی وہ چھت پر پرندوں کے ساتھ باتیں کرنے اور انہیں دانہ ڈالنے میں مشغول ہوگی۔ اس کی سنگاپور کی فلائٹ کے لیے تین گھنٹے رہ گئے تھے اور اب تک پیکنگ بھی نہیں کی تھی۔ اس نے نوکر کو آواز دے کر کافی اور ڈسپرین لی اور ایر کینڈیشنر کو تیز کر کے نرم سفید تکیے کا آدھا حصہ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ دیر تک وہ اس حالات میں لیٹا رہا پھر اٹھ کر اماں بی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ جائے نماز پر ہاتھ اُٹھائے دعا مانگنے میں محو تھیں وہ ان کے پاس کھڑا رہا۔ ان کے سفید چادر سے جھانکتا نورانی چہرہ دیکھتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اماں بی کیا دعا مانگ رہی ہیں میرے لیے اولاد کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ دعا مانگ مانگ کر اور سارے علاج معالجے، ٹونے ٹوٹکے کر کر کے وہ تھک چکی تھیں اور اب مایوس ہو کر اس پر دوسری شادی کے لیے دباؤ ڈال رہی تھیں وہ ایک عجیب کش مکش میں مبتلا تھا۔ وہ جانتا تھا اماں جی نے جو کہہ دیا وہ پتھر کی لکیر ہوتی ہے خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز آخر کار وہ اتنے بڑے نواب کی اکلوتی بیٹی اور نواب آصف جاہ کی سب سے چہیتی بہن جو تھیں خاندان کا زعم اور اپنی خوبصورتی پر نازاں رہنے والی اماں بی اپنے آگے کسی کی نہیں سنتیں۔ دوسری طرف صوفیہ کی محبت تھی جو اسے خوبصورت سنہری ریشمی دھاگے میں پوری طرح جکڑ چکی تھی، شادی کے دس سال کے طویل انتظار کے بعد بھی اس کا اتنا بڑا محل بچے کی کلکاریوں کی نغمگی سے محروم تھا۔ کچھ دیر تک اماں جی کے پاس کھڑا رہا پھر واپس چھت پر چلا گیا۔

یہاں صُوفیہ پرندوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھی۔ وہ بھی پرندوں کو دانے ڈالنے لگا۔ صوفیہ کو پرندوں سے عشق تھا۔ چھت پر بے شمار رنگ برنگے اور نایاب پرندوں کی چہچہاہٹ سے اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ ابھر کر آجاتی۔ وہ اپنے آسٹریلین طوطے کو سیب نہیں کھانے پر ڈانٹ رہی تھی۔ کس طرح وہ پرندوں سے دل کی ساری بھڑاس نکالتی ہے، کیسی تڑپ اور بے بسی ہے وہ سوچ کر اداس ہو گیا۔ اس نے دھیرے سے اُس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ صوفیہ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی اداس آنکھوں میں صحرائی ویرانی تھی۔ پھر وہ پرندوں میں دوبارہ کھو گئی اس کی خاموش بے التفاتی پر وہ غم زدہ ہو گیا۔ پھر وہ چھت سے اُتر کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سمندر کی گیلی ہواؤں کا ہلکا سا شور تھا جس سے کھڑکی کے ریشمی پردے ہل رہے تھے۔ اس نے تھوڑا سا پردہ سرکایا۔ دور سمندر کی بپھری ہوئی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ کتنا مغرور ہے سمندر اپنے آگے ہر شے کو ہیچ سمجھتا

ہے بالکل اماں بی کی طرح۔

میری زندگی میں بھی سمندر جیسی اتھل پتھل ہے، اماں جی صوفیہ سے بات نہیں کرتی ہیں۔ صوفیہ اماں بی کو دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ مجھ سے بھی وہ لمحہ لمحہ دور ہوتی جارہی ہے چھوٹے سے خاندان کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ جس دن سے اماں بی نے اداس سردرات کے سناٹے میں کھانے کی میز پر اسے دوسری شادی کا حکم دیا تھا اس لمحے کے دن سے ایک سلگتی ہوئی سی خاموش چنگاری اس کے پورے گھر کو دھیرے دھیرے جلارہی تھی۔

اف خدا! میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ کس سے اپنے دل کی حالت بیان کروں! یخ کمرے میں وہ پسینے میں بھیگ گیا۔ ایک طرف ماں کی تمنا تو دوسری جانب صوفیہ کی لازوال چاہت نے اسے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ زندگی کے خوبصورت سفر میں صوفیہ نے جتنا اسے پیار دیا تھا وہ مکمل طور پر اس میں ڈوب چکا تھا۔ جتنی وہ خوبصورت تھی اس سے کہیں زیادہ اس کے پیار کا انداز حسین تھا۔ وہ سوچتا رہا اور وارڈ روب سے اپنے کپڑے سوٹ کیس میں رکھتا رہا۔

آج شاید پہلی بار وہ اپنا کام خود سے کرر ہا تھا ورنہ ہمیشہ سفر پر روانگی سے قبل ہر شے سلیقے سے سجا کر صوفیہ اس کے حوالے کردیتی تھی۔

ابھی فلائیٹ کی روانگی میں دیر تھی وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ سیکریٹری نے اسے جو ٹور پروگرام دیا تھا اسے دیکھنے لگا۔ پورے دس دنوں کا سفر تھا۔ سنگاپور، چائنا، ہانگ کانگ کے کمپنیوں کے ایم ڈیز سے ملاقات اور ان کے ساتھ کھانے اور میٹنگز کے اوقات مقرر تھے۔

درد کی شدت میں کمی آگئی تھی پھر بھی وہ سر جھکائے بے خیالی میں ہتھیلی کے آدھے حصے سے اپنی پیشانی دباتا؟۔

اسی لمحے صوفیہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے قریب آکر کھڑی ہوگئی اور خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ آج نہ جانے کیوں اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اچانک ایک خواہش اس کے سینے میں بے تاب ہونے لگی۔

ایک طویل بوسے کی خواہش اور ایسے ہی لمحے میں اس کا دم نکل جائے دونوں ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ پھر صوفیہ کا دل چاہا کہ وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر خوب روئے مگر نہ جانے کون سی طاقت تھی جو اسے روک رہی تھی۔ ایک نامعلوم سی دوری تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسا جذبہ ہے کیسی طاقت ہے اندر محبت اور نفرت کا ایک ساتھ اجاگر ہونے کا یہ کون سا طریقہ ہے دونوں جذبوں کے بیچ کا حصہ جیسے آسمان اور زمین کے درمیان کا حصہ خلا صرف خلا اور کچھ نہیں۔

مگر سب کچھ ایسا ہی تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا وہ سر جھکائے اسکے قریب کھڑی ناخنوں سے نیل پالش کھرچتی رہی۔

خدا حافظ کہتا ہوا اسد جاہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ وہ ہر ہر لمحے کو اور اس کے اٹھتے قدموں کو اپنی آنکھوں میں محفوظ کر رہی تھی ڈارک براؤن سوٹ میں ملبوس وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کی مرسڈیز کی سرخ لائٹ دور ہوتی ہوئی معدوم ہوگئی وہ اب اکیلی گیلری میں کھڑی محل کی اونچی اونچی دیواروں کو تک رہی تھی۔

باہر ہلکی بارش کی ترچھی ترچھی پھواروں سے بھیگی سڑک دور تک خاموش اور سنسان ہوئی پڑی تھی، وہ دیر تک بارش میں بے خیالی کے عالم میں بھیگتی رہی، اسے اپنے چھوٹے سے دو کمرے کے اکھڑے ہوئے پلاسٹر کا پہلا کوارٹر بے حد یاد آرہا تھا۔ بابا کے سردار جی کے لطیفوں پر سارے بھائی بہن کس قدر ہنستے رہتے۔ کیسی خوشیوں بھری زندگی کا خواب تھا۔

پھر ایک دن یونیورسٹی میں امریکن جارحیت کے خلاف تقریر کرنے پر چھوٹے نواب اسد جاہ نے چیف گیسٹ کے طور پر بیسٹ پرائز کے ساتھ اسے اپنا دل بھی دے دیا، اور وہ چند ماہ حیدری کوارٹر سے آصف محل، کے کمرۂ خاص میں دلہن بنی حیرت سے قیمتی فانوسوں اور دبیز قالینوں کو تک رہی تھی۔

اور آج دس سال کے طویل عرصے بعد وہ رات کے سناٹے میں گیلری میں بھیگتی ہوئی تنہا کھڑی خاموشی سے روتی رہی۔ کالی رات کی فضا میں حبس تھا۔ ہوا اتر چکی تھی اور محل کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔

اپنے سارے بزنس میٹنگز کو منسوخ کر کے اسد جاہ اچانک رات کی فلائٹ سے کراچی پہنچا اور سیدھا اماں بی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اپنی کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں صوفیہ نکھری نکھری سی مسکراتی ہوئی اس کا استقبال کرتی لیکن آج کھڑکی بند تھی۔

شاید وہ کلب میں ہوگی یا اوپر پرندوں کے پاس، اسے اسد جاہ کے آنے کا علم بھی تو نہیں تھا۔ وہ سوچتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔

"اماں بی!" وہ ان کے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ "میں صوفیہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں مرجاؤں گا مرجاؤں گا اماں جی۔ اور شاید وہ بھی۔" وہ رونے لگا۔

'اب اپنا فیصلہ واپس لے لوں میں دوسری شادی نہیں کرسکتا۔ میں مجبور بھی تو ہوں۔

ڈاکٹر نے مجھے بتادیا ہے کہ میں اولاد پیدا نہیں کرسکتا۔" وہ سسکنے لگا۔

اماں بی نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا وہ بھی رونے لگیں سسکتے ہوئے جوان بیٹے کے آنسوؤں سے وہ شاید پگھل گئی تھیں۔

"کچھ بھی نہیں بچا ہے میرے لال۔ صوفیہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی!"

صوفیہ چلی گئی۔ کب؟ کہاں؟ وہ حیرانی سے چیخا اور بھاگتا ہوا اوپر اپنے کمرے میں پہنچا۔ وہاں کی ہر شے سلیقے سے اسی طرح سجی ہوئی تھی اس کی رنگ برنگی چوڑیاں اور سارے زیورات ویسے ہی پڑے تھے۔ لیکن بستر کے

چادر کی بے شمار شکنوں سے اس کی بے قراری اور بے چینی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا۔

سامنے سنگھار میز پر ایک خط پڑا تھا۔

''اسد جان! مجھے یقین ہے تم سنگاپور سے واپس آکر اماں جی کے حکم کے آگے جھک جاؤ گے، اس لمحۂ رفاقت میں تم نے ہر وہ شے مجھے دی جو مجھے نہیں چاہیے اور جس کی تمنا میں عمر گزار دی وہ نہیں دے سکے۔ ہم دونوں ہمیشہ اپنے ارمانوں اور خواہشوں کی سنہری زنجیر میں جکڑے رہے لیکن تمنائیں اور خواب تو بادل جیسے ہوتے ہیں۔ بے منزل، بے حقیقت اور دھواں دھواں۔!

میں پھر بھی تمہارے ساتھ جی لیتی لیکن میری زندگی میں ہی کوئی دوسرا تمہارے پہلو میں آجائے میں شاید مرجاؤں گی۔ یہ کیسا انصاف ہے قصور تمہارا اور سزا مجھے ملے۔ آج میں ہمیشہ کے لیے تم سے دور جارہی ہوں۔ میرے پیچھے نہیں آنا۔ اس سائیں بابا کے آستانے پر سکون ڈھونڈنے جارہی ہوں۔ جاتے جاتے میں نے سارے پرندوں کو آزاد کردیا ہے لیکن تم حیران ہوگے اسد جان کہ آسٹریلین طوطا اڑتا اڑتا پھر واپس آگیا ہے اور ایک تم ہو **Cowaed**''! صوفیہ

وہ خط لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اچانک ہی درد کی ایک تیز لہر اس کے سر میں گردش کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور سانسیں بے قابو ہورہی تھیں سارا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا جیسے میلوں کی مسافت بھاگتا ہوا طے کرکے آیا ہے۔

اماں بی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں بے قرار ہوکر اسے معصوم بچے کی طرح اپنی آغوش میں لے کر پیار کرنے لگیں۔ پھر اس کے ہاتھ سے خط لے کر نیچے چلی گئیں اور بڑے سے محل کے درمیان نواب آصف جاہ کی بڑی سی تصویر کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔

''مجھے معاف کردو آصف جاہ!'' دھیرے سے ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''میں بہت شرمندہ ہوں ایک مدت سے کرب اور پچھتاوے کی آگ میں مسلسل جل رہی ہوں۔ گذری ہوئی کالی رات کا منحوس سایہ صدیوں بعد ایک بار پھر ہمارے گھر پر منڈلا رہا ہے۔ تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

لیکن اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں اپنی طرح صوفیہ کو اس آگ میں نہیں جلنے دوں گی۔ اولاد کیلئے جو لغزش مجھ سے ہوئی تھی وہ اسے نہیں کرنے دوں گی۔ میں اسے آستانے تک کبھی نہیں جانے دوں گی۔ ہرگز نہیں!''

وہ ایک عزم سے اپنی قیمتی شال کو جسم پر لپیٹ کر باہر نکلیں اور ڈرائیور کو آستانے کا پتہ بتا کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

❁❁

Address:
V-E, 16/3, Zazimabad, Karachi.

یٰسین احمد

ونکم

"کٹ......کٹ......"

ہدایت کار بی آر پلّے پوری قوت سے چلایا تھا لیکن اس کا ساؤنڈ سسٹم بہت ناقص تھا۔ پوری قوت سے چلاتا تو بھی آواز بالکل دبی دبی، پھنسی پھنسی اور باریک نکلتی، ایسے لگتا تھا جیسے چڑا اور چڑیا نے آپس میں چونچیں لڑائی ہوں۔ اس لیے شوٹنگ کے موقعوں پر اشاروں سے کام لیتا تھا۔ لیکن اس وقت کسی نے اس کے اشاروں کو دیکھا اور نہ آواز سنی۔ ہر ایک دم بخود کھڑا اس سین کو دیکھ رہا تھا جو چند ھیائی روشنی میں فلمایا جا رہا تھا۔ وہ غضب کا ہوشربا منظر تھا۔

ہیروئن میناکشی اپنی بانہیں ہیرو جے پال کی گردن میں حمائل کیے آہستہ آہستہ اپنا بایاں پاؤں اور اُٹھاتی ہوئی فرش کی طرف جھکتی جا رہی ہے۔ جیسے جیسے جھکتی جا رہی ہے ویسے ویسے بلوز کے اُوپری حصہ سے اس کے سینے کی گولائیاں نمایاں ہوتی جا رہی ہیں۔ جے پال اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کو تھامے اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لے آتا ہے......قریب......اتنا قریب کہ دونوں کی سانسیں آپس میں ٹکراتی ہیں۔

اسکرپٹ کے مطابق سین کو اس حد تک ہی فلمانا تھا۔ پلّے نے بھی ان دونوں کو یہی ہدایت دی تھی۔ لیکن جے پال نے گڑبڑ کر دی تھی۔ اس نے اپنے لب میناکشی کے لبوں پر رکھ دیے تھے۔ میناکشی نے بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔

مہورت کا یہ پہلا شارٹ تھا اور پہلے ہی شارٹ پر گڑبڑ ہو گئی تھی۔

"کٹ......کٹ......!"

پلّے اِدھر اُدھر پھدکتے ہوئے جیسے شٹل کاک کھیل رہا ہو، پھر چلایا تو کیمرہ مین نے اپنا کیمرہ بند کیا۔ لائٹس بجھا دیے گئے اور اب جیسے سب کو ہوش آیا۔ میناکشی بھی چونکی، اس نے اپنے کو جے پال کی بانہوں سے چھڑایا اور تقریباً دوڑتی ہوئی میک اپ روم میں گھس کر دروازہ بند کر لیا تھا۔ جے پال سر جھکائے ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی خجالت کے آثار نہیں تھے بلکہ سرور سا طاری تھا۔ جیسے شمپین کا ایک پیگ رگوں میں سرایت کر گیا ہو۔

اس کے قریب فلم کا پروڈیوسر بھاسکر راؤ بیٹھا تعریفی نظروں سے جے پال کو گھور رہا تھا۔ اس شارٹ نے اس کو نہال کر دیا تھا۔ حالانکہ شارٹ او کے نہیں ہوا تھا۔ صرف وقت اور پیسہ برباد ہوا تھا۔ لیکن اس کو قطعی ملال نہیں

تھا۔ وہ بہت دولت مند تھا۔ اس کو یہ علم بھی نہیں تھا کہ کہاں کہاں پر اس کی دولت پڑی ہوئی ہے۔ اگر ایسی دس فلمیں بھی فلاپ ہو جاتیں تو اس کے ماتھے پر ہرگز بل نہیں آتا۔ اس وقت تو بھاسکر راؤ کی حالت بالکل ایسی ہی تھی جیسے، ایک بار دیکھا اور بار بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ کڑواہٹ تو بی آر پلّے کے بدن میں پھیلی تھی۔ مہورت کا پہلا شارٹ او کے، نہ ہونا اس کے نزدیک بدشگونی کی علامت تھی۔ شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے وہ بے حد خوشگوار موڈ میں تھا۔ اسٹوڈیو میں ہر ایک آنے والے چھوٹے بڑے کو ''وِنکم، وِنکم'' کہہ کر گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ لیکن اب خار کھائے بیٹھا تھا۔

''یہ کیا ہے؟ یہ سب کیا ہے؟'' وہ جے پال کے نزدیک آ کر اسکرپٹ کے کاغذات پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نے کتنی بار تم کو سین سمجھایا تھا؟''

لیکن جے پال نے اپنا جھکا ہوا سر اُوپر نہیں اُٹھایا اور نہ منہ سے کچھ بولا۔ یہ اس کی ندامت نہیں تھی، معصومیت تھی۔ وہ تھا بھی بہت معصوم اور وجیہہ۔ جہاں دیدہ عورتیں دیکھتیں تو سوچتیں کہ اس کو نچوڑ لیں۔ لیمو پانی کی طرح پی جائیں۔

بی آر پلّے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان دونوں نے یہ حرکت کیوں کی تھی۔ یہ ان دونوں کی پہلی فلم تھی لیکن اداکاری ان دونوں کی گھٹی میں تھی۔ فلمی دنیا کی چمک دمک سے وہ دونوں واقف تھے۔ مینا کشی اپنے دور کی انتہائی مشہور اداکار سدھیر کمار کی پوتی تھی۔ سدھیر کمار نے عالمی سطح پر مقبولیت حاصل کی تھی۔ وہ بیک وقت ایک اداکار، ایک کامیاب ہدایت کار تھا۔ کہانی، گیت اور ایڈیٹنگ پر بھی اس کی نظر بہت اچھی تھی۔ اپنی زندگی میں سدھیر کمار نے جتنی فلمیں بنائی تھیں وہ سب کی سب ہٹ ہوئی تھیں۔ وہ جب تک زندہ رہا اپنے گھر، اپنے خاندان کی کسی عورت کو کیمرے کے سامنے آنے نہیں دیا تھا۔ کیمرہ تو بہت دور کی بات ہے، کسی فلم کے مہورت پر یا پریمیئر شو میں بھی اس کے خاندان کی کوئی عورت نظر نہیں آتی تھی۔ جب بھی کوئی فلم بناتا، نئے چہروں کو لے کر بناتا اور ان پر اپنی مرضی چلاتا۔

''تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہاں تمہاری ماں بھی بیٹھی ہوئی ہے؟'' پلّے کا غصہ ابھی دور نہیں ہوا تھا۔ جے پال نے فوراً سر گھما کر اپنی ماں کو دیکھا جو سب سے الگ تھلگ ایک گوشے میں بیٹھی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی ایک زمانے میں مقبول اداکارہ رہ چکی تھی۔ اس نے جس پہلی اور آخری فلم میں کام کیا تھا اس کی ہدایت کاری سدھیر کمار نے دی تھی۔

اس کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اس نے تین سال کے لیے سدھیر کمار سے کنٹریکٹ پر دستخط کیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ جیسے آکاش میں اڑی جا رہی ہے۔ سدھیر کمار کی فلموں میں ہیروئن کی حیثیت سے کام کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ وہ اس معاہدہ کو اپنی خوش نصیبی سمجھ رہی تھی۔ فلم شروع ہوئی، اس کو شہرت، دولت، کار، فلیٹ

اور ایک عالی شان زندگی گزارنے کے لیے جو کچھ ضروری تھا وہ سب ملتا گیا۔ وہ سدھیر کمار کی عزت کرنے لگی تھی۔

اسی فلم کی شوٹنگ کے دوران اسے ایک سین میں اپنے شیر خوار بچہ کو دودھ پلانا تھا۔ سدھیر کمار چاہتا تو اس سین کو کچھ اور طریقہ سے فلما سکتا تھا۔ لیکن سدھیر کمار نے اسے بتایا کہ کیمرہ کے سامنے اپنے بلوز کے بٹن کھولے اور بچہ کے منہ میں اپنی چھاتی دے۔ اس نے اس قسم کا شارٹ دینے سے انکار کر دیا تھا لیکن سدھیر کمار نے نہیں مانا، اپنی ضد پر اڑا رہا اور کہا۔ ''تم کو کسی بیڈروم سین کے لیے بے لباس نہیں ہونا ہے۔ بلکہ اپنے بچہ کو دودھ پلانے کے لیے اپنی چھاتی دکھانا ہے۔ تمہارے چہرے پر ممتا کی عظمت اور جلال دکھانا ہے۔''

مجبوراً اس کو سدھیر کمار کی بات ماننی ہی پڑی تھی۔ یہ فلم بنی اور ریلیز ہوئی اور سوپر ہٹ ثابت ہوئی۔ لیکن جہاں جہاں اس فلم کے پوسٹرس لگے اور جن جن رسالوں میں اس فلم کے تذکرے چلے ان میں اسی سین کو اُچھالا گیا۔ اسے گھن آنے لگتی تھی، اپنے آپ سے، اس فلم سے اور سدھیر کمار سے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد سدھیر کمار سے نفرت سی ہوگئی تھی کہ اس نے ہر فلم میں کسی نہ کسی سین میں عورت کو بے لباس کیا ہے۔ آرٹ اور حقیقت نگاری کا حوالہ دے کر......اور پھر اس کے بعد اس نے کسی فلم میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور مکمل طور پر فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

اس کے بیٹے جے پال کو ایک فلم میں ہیرو کی حیثیت سے سائن کیا گیا تھا تو وہ کئی سالوں بعد آج مہورت پر اسٹوڈیو میں آئی تھی۔ اس اتفاق سے اسے مسرت محسوس ہو رہی تھی کہ سدھیر کمار کی پوتی اس کے بیٹے کے مقابل ہیروئن کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔

بی آر۔ پلے کو جے پال سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ تیزی سے لیک کر اس کی طرف آیا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''دیکھا بہن جی! آپ کے بیٹے نے مہورت کا پہلا شارٹ کس طرح برباد کیا؟''

وہ فوراً کوئی جواب دے نہ سکی۔ غور سے پلے کا چہرہ دیکھنے لگی۔ کچھ لمحوں کے لیے اس کا دماغ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وقت کتنا سفاک ہوتا ہے؟ اچھے اچھے سورماؤں کو پچھاڑ دیتا ہے، جلد یا بدیر......سدھیر کمار زندہ ہوتا تو دیکھتا کہ آج اس کی پوتی......!

''کیا بُرائی ہے اس سین میں؟'' وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ پلے کا منہ حیرت سے کھلا اور کھلا ہی رہ گیا۔ وہ بولی۔ ''مینا کشی کا دادا فلم کی کامیابی کے لیے ایسے سین کو ضروری سمجھتا تھا۔ آپ بھی اس سین کو ''ونم'' کہیے، ونم......!''

❀❀

Address:
17-2-1159/2, Wahed Colony,
Function Hall Lane, Pos., Yakutpura,
Hyderabad - 500 023. (A.P.) India

عشرت بیتاب

وہ عورت

اسے عورت سے سخت نفرت تھی، پھر بھی اس کے سر پر وہ پھول دان نما مجسمہ موجود تھا جس میں ایک نیم برہنہ عورت کمر پر کلسی لیے کھڑی تھی وہ اسے کافی حد تک محفوظ رکھنا بھی چاہتا تھا۔

''عورت قابل احترام ہے کہ وہ ماں بھی ہے'' دوستوں نے اسے سمجھایا۔

''ماں کی عظمت سے کون کافر انکار کرتا ہے...... لیکن عورت!''

''عورت کی تخلیق مرد کے لیے ہی ہوئی ہے''

''تا کہ وہ مرد کو اپنی انگلی پر نچا سکے''

''نہیں! مرد تو اس کا مجازی خدا ہے''

''عورت تو خود کو دیوی سمجھتی ہے اور خود ساختہ خدا بھی تو پھر اس کے مجازی خدا کی حقیقت ہی کیا''

عورت کی چکنی مگر تہہ دار شخصیت سے اسے نفرت سی ہو گئی تھی وہ اکثر کہتا

''اللہ نے پہلے مرد کو پیدا کیا...... اس وقت مرد خوب مست ہو کر جی رہا تھا۔ عورت کی تخلیق ہوئی کہ مرد تنگ دست، تنگ نگر ہو کر رہ گیا اور پھر اس کی ہستی ہی ختم ہو گئی۔

ہاں عورت، ننھی سی مورت، لڑکی کی صورت میں بھلی لگتی ہے جہاں عورت بنی کہ مرد پر عذاب شروع...... ویسے ماں کی صورت، بھگوان کی صورت سے جدا نہیں...... لیکن غضب کیا بھگوان نے، عورت کو کئی روپ دے دیا اور اس پر طرّہ یہ کہ وہ ہر صورت میں جدا جدا سی لگتی ہے۔

وہ لڑکی، عورت کی وہ صورتوں سے بالکل جدا سی تھی۔ وہ اس کے ساتھ پڑھی، لکھی، پلی، بڑھی...... لیکن ایک دن اچانک اس لڑکی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کا باہر نکلنا، اِدھر اُدھر آنا جانا...... بالکل بند کر دیا گیا۔ کل تک وہ اس کے ساتھ لکھتی پڑھتی رہی۔ ساتھ ساتھ کھیلتی کودتی رہی لیکن معلوم نہیں کیا ہوا کہ اس کے والدین نے اس کی پڑھائی بند کروا دی اور اسے گھر کی چہار دیواری میں مقید کر دیا۔

اسے بہت بُرا لگا۔ اس نے اپنی امی کو بتلایا کہ ''جو ہی خالہ کی لڑکی آج کل اسکول نہیں آ رہی ہے۔ آپ خالہ کو سمجھائیں اس طرح درمیان میں ہی پڑھائی چھوڑ دینا مناسب نہیں'' گفتگو سے اس کے اندر کا چور جھانکتا نظر آ رہا تھا۔

امی نے اپنی بہن سے رابطہ پیدا کیا۔ اس کو لڑکیوں کی تعلیم کی افادیت بھی سمجھائی۔ مگر وہ مجبور تھی کہنے لگی۔

''ہمارے سسرال والے راضی نہیں''

''کیوں؟ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہوئی ہے''

''دادی ساس کا کہنا ہے کہ لڑکی بالغ ہوگئی ہے''

''تو......''

''بالغ لڑکی کا اِدھر اُدھر آنا جانا مناسب نہیں''

''بڑے دقیانوسی خیالات کے لوگ ہیں''

امی خاموش ہوگئیں۔ لیکن اپنے لڑکے کی دلچسپی کو بغور پڑھتی رہیں۔

اسے وہ لڑکی بھاگئی تھی اس کی خبر امی کو بھی تھی۔ اس کی معصوم تیکھی صورت، پتلے پتلے رسیلے ہونٹ، سے اس کے دل و دماغ میں تروتازگی سی آجاتی۔

لڑکی کا اس طرح اچانک پردے میں چلا جانا اسے گراں گزر رہا تھا۔ وہ نڈھال سا ہوگیا۔ تنہا اسکول آنا جانا اور چار، پانچ گھنٹے وہاں کاٹنا پہاڑ سا لگتا۔ خصوصاً وقفے کے اوقات میں اس کی کمی شدت سے محسوس کرتا کہ ان لمحوں میں وہ دونوں اکثر ساتھ ہوتے تھے۔ ٹفن دونوں ایک ساتھ کرتے اور خوب مٹرگشتی کرتے تھے۔ اب شام کو اسکول سے تنہا واپس آنا پڑتا تو دل چھوٹا ہوجاتا...... کھیل کود میں بھی دل نہیں لگتا اس لیے وہ اکثر شام ڈھلتے ہی تفریح کے لیے اِدھر اُدھر نکل جاتا۔ ایک روز واپسی پر ایک اسٹیشنری کی دکان میں جا گھسا۔ وہاں ایک خوبصورت سے سنگِ مرمر کے پھول دان پر نظر پڑگئی۔ جس میں سنگِ مرمر کی تراشی ہوئی ایک عورت نیم برہنگی کی صورت کمر پر کلسی لیے تھی اسے بھلی لگی۔ اس نے اسے خرید لیا۔ اس مجسمے میں اسے وہ لڑکی...... عورت کی صورت میں ڈھلتی نظر آرہی تھی۔ وہ جاذب نظر لڑکی جواب اس کی منظور نظر بن گئی اس سانچے میں وہ جیسے ڈھل سی گئی۔

اس نے مدھیا مک تک کی تعلیم مکمل کرلیا تھا۔ اور پشتینی دکان پر دونوں وقت پابندی سے بیٹھنے لگا تھا۔ ابو بیمار بیمار سے رہنے لگے تھے۔ ڈاکٹروں نے انہیں مکمل آرام کی ہدایت دی تھی۔ امی بھی کمزور و نحیف دکھنے لگی تھیں۔ معاشی کمزوری سے انسان کتنی جلد ٹوٹ جاتا ہے اس کا احساس اسے شدت سے ہونے لگا۔ ایک چھوٹی سی دکان جس پر چار پانچ افراد پر مشتمل کنبے کی کفالت

وہ آگے کی تعلیم چھوڑ کر مکمل طور پر دکان سے جڑ گیا اور آمدنی میں مزید اضافے کی صورت پیدا کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اس کی دلچسپی اور لگن دیکھ کر امی ابو خوش تھے اس لیے لگے ہاتھوں اپنی اول ذمہ داری بھی پوری کرلینی چاہی جس کے وہ لوگ خواہاں تھے۔

خالہ نے بھی ہونہار لڑکے کو دیکھ کر حامی بھر دی اور اس طرح وہ لڑکی اس کے خوابوں کی لڑکی...... اس کی زندگی کے آنگن میں اتر آئی۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے میز پر رکھے ہوئے پھول دان کے تیکھے خدوخال والی عورت مجسمے

سے نکل کر اس کے سامنے زندہ جاوید کھڑی ہوگئی ہو۔ کپڑے میں ملبوس ہوتے ہوئے بھی اسے مجسمے والی عورت کی طرح وہ لڑکی بھی نیم برہنہ سی نظر آرہی تھی۔ اس نے مجسمے کے بدن پر باریک اور مختصر کپڑے کی طرف اشارہ کرکے اس لڑکی کو کہا...... جواب پوری کی پوری اس کی تھی۔

''تم بالکل ایسی دکھتی ہو''

اس لڑکی نے نظر اُٹھا کر کن اکھیوں سے اس ماڈل کو دیکھا اور شرما کر آنکھیں پھیر لیں۔

اس نے اصرار کیا کہ وہ ایک بار...... اس صورت میں ڈھل جائے

وہ کسمسا کر رہ گئی...... تیار ہوئی...... وہ بھی خاموش ہوگیا اور سوچتا رہا کہ وہ لڑکی جو کچھ سال قبل اس کے ساتھ کھیلا کودا کرتی تھی چند سالوں کی جدائی میں مکمل عورت کی صورت میں کس طرح ڈھل گئی۔

دوسرے روز ایک بار پھر اس نے اپنی خواہش ظاہر کی...... وہ راضی ہوگئی...... پھر وہ آہستہ آہستہ مجسمے کی صورت میں ڈھلتی چلی گئی...... وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں کو میچتے ہوئے کہا......

''کمی بس کمر پر کی ہے''

اس نے شرما کر اپنی آنکھیں موندلیں...... تب اس کا من چاہا کہ اس کے جسم پر منوں گھڑے پانی انڈیل دے...... تا کہ نیم ڈھکے گیلے کپڑوں میں اس کے جسم کے سارے نقوش اُبھر آئیں اور تب وہ ایک مصور کی طرح اس کے سارے خدوخال کاغذ پر اُتارلے اور پھر میز پر رکھے اس پھول دان کے مجسمے کے برابر رکھ دے۔

وہ کافی دیر تک ایک مصور کی آنکھوں سے اسے نہارتا رہا کہ یکبارگی لڑکی کی آنکھیں اس سے چار ہوئیں تو وہ شرما گئی اور مارے شرم کے اپنا منہ اس کے سینے میں چھپالیا...... دور پڑوس کے گھر میں ٹی وی پر یہ فلمی گیت بج رہا تھا۔

ہم کو ہم ہی سے چرالو......

پھر چیت چوری کا یہ کھیل مدتوں چلتا رہا دونوں ایک دوسرے میں اس طرح گم ہوتے چلے گئے کہ جدا ہونا محال تھا......

مگر ایک دن جدائی کا بگل بج گیا

وہ لڑکی پوری طرح عورت کی ذات میں ڈھل گئی تھی وہ بضد تھی...... کہنے لگی۔

''کہ اس کے زیور ایک ایک کرکے سب اتر گئے......اسے وہ تمام زیور واپس چاہئیں''

وہ کمزور انسان...... بے بس سا ہو گیا اس نے اسے سمجھایا......

''تمہارے تمام زیورات اس گھر کی تعمیر نو میں پیوست ہیں تمہارے خاوند کی تجارت اور ترقی میں پنہاں ہیں اور پھر تمہارا اصلی زیور تو میں ہوں''

مگر بدذات، اڑیل ٹٹو کی طرح اڑ گئی کہنے لگی......

''میں زیور کے بغیر بالکل ننگی ہوگئی ہوں...... میرے گھر والوں نے اسے بیچنے کے لیے تھوڑا ہی دیا تھا''

وہ اسے سمجھاتا کہ...... ''جو اپنے شوہر کے لیے جسم سے ننگی ہوسکتی ہے وہ زیور سے ننگی ہوئی تو کیا ہوا؟''

آخر بات بگڑتی چلی گئی اور علاحدگی کے حدف پر ناوک پڑا کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ عورت کی اگر ناک نہ ہوتی تو۔ وہ لڑکی اپنی ضد پر اتر آئی کسی ایک کی نہ سنی...... اپنے خاوند کی حاجتوں اور امی ابو کی شفقتوں کو بالائے طاق رکھ کر دور...... اس کی دنیا سے دور چلی گئی۔

لیکن اس کے سامنے میز پر پھول دان والی مجسمہ کی وہ برہنہ عورت کمر پر کلسی لیے اب بھی موجود ہے جو اسے دعوت نظارہ دے رہی ہے اور وہ یہ شعر گنگنائے جا رہا ہے۔

ہم کو ہم ہی سے چرالو......................

❁❁

Address:
Jahangiri Mohalla
ASANSOL (West Bengal)
INDIA

فکاہیہ

لُک آنجن

عتیقہ ناز

بچپن ہی سے مجھے گُم ہو جانے والوں سے خاصی دلچسپی رہی۔ اسرار کی ایک چادر جس میں وہ لپٹ جاتے تھے میرا دل چاہتا تھا کہ چادر کے اس پار دیکھوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اخبار میں تلاش گمشدہ کے اشتہارات کا حصہ توجہ کے ساتھ پڑھتی اور بعد میں دیر تک اس پر تفکر کرتی۔ مسجد سے جیسے ہی اعلان ہوتا کہ حضرات ایک بچہ جس کی عمر، اسے سنتے ہی میں سراپا کان بن جاتی۔ کوئی لاپتہ ہو گیا ہے۔ اب پتہ نہیں کہاں ہوگا، اس کے ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔ اب اس کے ہاتھ پیر توڑ کر فقیر بنا دیں گے۔ بے چارہ کسی بہت بُری جگہ پر ہو گا یا ہوگی۔ کافی عرصے تک میں یہی سمجھتی رہی کہ صرف ہی اس قسم کے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ نہیں جناب تھوڑے بڑے ہوئے تو معلوم ہوا کہ بڑے بچے بھی گُم ہو جاتے ہیں۔ ہر اس قسم کی نصیحتیں ہوتی رہتیں۔ ارے ٹیکسی اور کاروں کے پاس سے احتیاط سے گزرا کرو۔ ذرا، دور ہی رہا کرو۔ گھسیٹ کر اندر کر لیتے ہیں اور کچھ سنگھا کر بے ہوش کر دیتے ہیں۔ پھر! میری آنکھیں کچھ پھیل جاتیں اور منہ کھل جاتا۔ پھر کیا لڑکیوں کو ڈال دیتے ہیں بیگار کیمپ میں جہاں غلام بنے ساری زندگی کام کرتے رہتے ہیں اور لڑکیوں سے پیشہ کراتے ہیں۔ توبہ! کتنے بُرے لوگ ہوتے ہیں۔ میں ذرا اور دبک کر سوچتی۔ اس قسم کی نصیحتوں کا سلسلہ عمر کی دوسری دھائی میں داخل ہونے کے بعد بھی چلتا رہا۔ یونیورسٹی میں پہلا دن تھا جب بی پڑوسن کو پتہ چلا کہ آج سے یونیورسٹی پڑھنے جایا کروں گی تو انہوں نے نصیحت کی۔ بیٹا وہاں کوئی کھانے کی چیز دے تو ہرگز مت کھانا۔ میں نے مزید کسی سوال کے بغیر سعادت مندی سے کہا ''جی خالہ جان۔''

کچھ وقت اور گزرا تو پتہ چلا کہ جناب یہ سامانِ پند و نصائح سے لیس بزرگ صاحبان بھی گُم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا الزائمر کی وجہ سے ہوتا ہے اور بھولنے کا کیا ہے۔ غالب جیسا شخص بے خودی میں کوئے یار تک بھول جاتا ہے۔ ویسے بھی مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ دراصل نسیان حضرت انسان کی جبلت ہے۔

لیکن اب اس عمر میں میرے لیے یہ بات خاصی انہونی تھی کہ خدا گُم ہو گیا ہے۔ یعنی کہ خدا گم ہو گیا ہے میری اس سوچ پر دونعوذ۔ اِس سلسلے میں کسی مسجد سے اعلان نہیں ہوا اور نہ ہی اخبار میں کوئی اطلاع آئی ہے۔ دل کو یہ سوچ کر صبر دیتی ہوں کہ مسجدوں میں تو آج کل لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی ہے اور اخبار والوں کے پاس اس سے زیادہ گرم خبریں بھی موجود ہیں دوسرے انہیں مقامی خبریں دیر سے ملتی ہیں۔ اگرچہ یہ اتنی مقامی خبر بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ آج کل خدا سے متعلق کسی بھی قسم کا تذکرہ پہلے بنیاد پرستوں میں اور پھر دہشت گردوں میں

لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں۔

لیکن کچھ چیدہ چیدہ باتیں ہیں جن سے اس قسم کے وسوسے دل میں جگہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے میں نے اپنی ہمشیرہ وغیرہ کو کچھ اس قسم کا شکوہ کرتے ہوئے پایا۔ اس گھر میں چیزوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سب لوگ مجھے ذمے دار ٹھہراتے ہیں کہ میں چیزیں اِدھر اُدھر رکھ کر بھول جاتی ہوں۔ اب میں آپ کو بتاؤں۔ ہاں کچھ لوگ گھر کی چیزیں اُٹھا کر تحفے میں دے دیتے ہیں۔ میں ہکا بکا ان کی شکل دیکھنے لگی۔ وہ مزید آگے چلیں۔ دیکھیے مجھے کسی نے شیشے کے فریم میں جڑا خوبصورت سا اللہ دیا تھا اور اسے میں نے یہاں سامنے والی دیوار پر لگا دیا تھا۔ پھر مجھے اس کی اتنی عادت ہوگئی کہ میں بھول گئی کہ وہاں اللہ موجود ہے یا نہیں۔ اور اب ایک ہفتے پہلے مجھے پتہ چلا کہ اللہ غائب ہے۔ یعنی وہ اس واقعے کے وقوع پذیر ہونے کا وقت بتانے سے قاصر ہے۔ آگے فرمانے لگیں۔ کوئی شخص سانس بھی نہیں لیتا کہ اللہ کہاں گیا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ کسی کو تحفے میں دے دیا گیا ہے۔ اس پر ایک اور شائلہ نے جنہیں شبہ تھا کہ ان پر شک کیا جا رہا ہے فرمایا۔ مگر کسی کو کیا ضرورت پڑی کہ اتنا پرانا اللہ کسی کو تحفے میں دے دے۔ یہ نکتہ اگرچہ قابل توجہ تھا۔ مگر کچھ تحائف ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں جب تک دل چاہے استعمال کریں اور جب ضرورت پڑے کسی اور کو بطور تحفہ دے دیا جائے۔ شاید اسی کو ایک پنتھ دو کاج کہتے ہیں۔

پھر میں نے اپنی ماں کو اکثر اس قسم کے شکوہ ہائے کرتے ہوئے سُنا۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں شبہ ہے کہ خدا کہاں چلا گیا ہے۔ تازہ ترین شکایت انہیں اس وقت پیدا ہوئی جب عراق پر امریکہ نے حملہ کر دیا۔ کہنے لگیں۔ ارے یہ بش کم بخت پورا خبیث ہے۔ اور یہ امریکہ خود پورا غنڈہ ہے۔ پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اتنے عراقیوں کو مار ڈالا۔ کسی نے دنیا میں جنبش نہ کی اور تو اور خدا کو دیکھو جیسے گم ہی ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔ اس پر کسی من چلے نے کہا۔ ہاں اماں! سچ پوچھیں تو ہندی فلموں کے بھگوان کی کارکردگی اس سلسلے میں زیادہ اچھی ہے۔ یہاں دعا مانگی اور یہاں ہی مال حاضر۔ اِدھر ڈیمانڈ اُدھر سپلائی۔ بھگوان کو معلوم ہے مارکیٹنگ کا زمانہ ہے اور Consumerism چل رہا ہے۔ کسی اور دل جلے نے دہائی دی۔ کیا کفرات بک رہے ہو تم لوگ۔ اماں دھاڑیں۔ سب صم بکم ہو گئے۔

مجھے معلوم ہے، اس خیال کی عمر خاصی پرانی ہے۔ اقبال کے زمانے میں بھی اس طرح کے شکوے ہوا کرتے تھے کہ

رحمتیں تیری ہیں سب اغیار کے کاشانوں پر
بجلیاں گرتی ہیں تو بے چارے مسلمانوں پر

لیکن اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت خدا گم نہیں ہوا تھا۔ ہمارا نہیں تھا تو غیر کا تو تھا اور یہ تو کہہ سکتے تھے کہ عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو۔

پھر ایک خیال اور آیا کہ فرض کریں کہ یہ واقعہ ہو چکا ہو تو آگے کیا کرنا چاہیے۔ ایک صاحب جو لوگوں کے مسائل کا روحانی حل پیش کرتے ہیں اور زرِ تعویذ چند ملی گرام زعفران کی قیمت سے زیادہ نہیں لیتے۔ ان سے جب دریافت فرمایا کہ لاپتہ کے لیے کیا کرنا چاہیے انہوں نے جواب دیا کہ ایک تعویذ کسی درخت یا گھر کے کسی ستون سے باندھ دیں۔ گمشدہ جہاں کہیں ہوگا۔ دس دن کے اندر حاضر ہوگا۔ انہی کی ایک معتقد خاتون سے ہم نے پوچھا کہ اُن کے روحانی علاج سے انہیں کچھ فائدہ ہے کہ نہیں۔ تو انہوں نے دونوں تھیلیاں اُلٹ دیں۔ ہائے ہمارے اعمال ہی کہاں ایسے رہے اور زمانے بھر کی آلودہ زبان میں تاثیر کہاں۔ اپنے اعمال کے بارے میں مَیں بھی کچھ ایسی پُر یقین نہیں۔ اس لیے خاموش ہوگئی۔

یہ تو توحید پرستوں کی باتیں ہیں۔ ان کو دیکھیں جنہیں ابھی یا کبھی بھی اس چیز پر یقین نہیں رہا کہ جس خدا کو ہم اتنا لپیٹتے اور کھولتے ہیں وہ وجود بھی رکھتا ہے اور دخل در معقولات (ماکولات) بھی کر سکتا ہے۔ جناب یہ وہ لوگ ہیں جو بہ بانگ دہل خود کو atheist یعنی دَہریہ کہتے ہیں۔ یہ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے defaultt میں ہے۔ دوسرے وہ جنہیں عین عالم شباب میں پتہ چلا کہ جام جم سے یہ میرا جام سفال اچھا ہے۔ اوّل الذکر عام طور پر مؤخر الذکر کے جینیاتی ورثاء ہوتے ہیں۔ ہاں، تو یہ لوگ بھی اکثر اس وقت جب کہ میں ربنا اٰتِنا فی الدنیا پڑھ کر آمین کہتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیر کر فارغ ہوتی ہوں۔ پوچھتے ہیں ہاں بھئی مل گیا خدا، کروالیں ساری دعائیں قبول۔ اس وقت میں قلندرانہ مسکراہٹ کے ساتھ خاموش رہتی ہوں۔ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔ اور ویسے ایک قلندرانہ خصوصیت یہ بھی ہے کہ قلندر کی Achilles heel نہیں ہوتی۔

اب ان محرومین کے لیے کیا عرض کروں۔ ایک دانشور فرماتے ہیں کہ Atheist کا سب سے بُرا وقت وہ ہوتا ہے جب وہ شکر کے جذبے سے بھرا ہوتا ہے مگر نہیں جانتا کہ کس کا شکریہ ادا کرے۔ لیکن میں نے انہیں اس سے زیادہ مہماتی صورتِ حال سے گزرتے دیکھا ہے۔ خاص طور پر جب وہ اپنے پوتا پوتیوں کے ساتھ ہوں۔ اسی طرح کا ایک ذکر ہے ایک بزرگ اپنی چھ سالہ پوتی اور دیگر اہل خانہ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ بچی دیگر لوگوں کے ساتھ ایک تفریحی پارک سے واپس آ رہی تھی اور حسب توقع گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے احتجاجی حالت میں تھی کہ پارک سے گھر واپس کیوں جا رہے ہیں۔ ابھی تو مجھے مزہ آ رہا تھا۔ اس نے روتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔
اس کی توجہ بانٹنے کے لیے دادا ابا نے دور سمندر میں نظر آنے والی کشتی کی طرف اشارہ کیا وہ دیکھو پانی میں کیا ہے؟
بچی کے منہ کے سارے زاویے یکدم صحیح ہو گئے اور گالوں پہ ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس نے بادبانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کشتی ہے اور کیا؟ اب پوچھو کہ کشتی پانی میں کیوں نہیں ڈوبتی؟ بچی کی آنکھوں میں سوچ کے سائے لہرائے۔ دادا ابا، کشتی پانی میں کیوں نہیں ڈوبتی؟

دادا ابا کو ہمیشہ یہ شکایت رہی تھی کہ ہماری قوم میں سے تجسّس کا جذبہ ختم ہو گیا ہے اور ان میں سوال پوچھنے کی

عادت ہی نہیں رہی۔ سب لوگ سراپا تسلیم و رضا بن گئے ہیں۔ یہ سوال سنتے ہی انہیں اُمید کی کرن نظر آئی اور انہوں نے فوراً اُسے جالیا۔

دادا ابا: بیٹا، دراصل کشتی کا وزن اگر کم ہو اور وہ زیادہ پانی ہٹائے تو وہ نہیں ڈوبے گی اور وزن اگر زیادہ اور کم پانی ہٹائے تو ڈوب جائے گی۔ اب دیکھو سامنے جو کشتی نظر آ رہی ہے اگر اس میں پتھر ڈالنا شروع کریں تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ ڈوب جائے گی۔ کیوں کہ وزن زیادہ ہوگا اور یہ کم پانی ہٹائے گی۔

پارک کا مزہ اب گُم ہو گیا تھا۔ چلتی ہوئی گاڑی میں بچی کو زیادہ کم وزن، پانی اور کشتی کے درمیانی تعلق سے زیادہ دلچسپی گذرنے والے مناظر میں ہو گئی تھی۔ اس لیے دادا ابا خاموش ہو گئے۔ دادا ابا کی خاموشی کا مطلب تھا وہ کچھ اور سوچنے لگے تھے۔ بچوں کو پیدائش کے وقت سے ہی توجہ حاصل کرنے کا فن آتا ہے۔ وہ بھی یہ مُہرہ پہلے سے جیتی ہوئی تھی۔ اس لیے کھلاڑی نے کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے نیا سوال پھینکا۔ دادا ابا وہ دیکھیں، وہاں کوے نہا رہے ہیں پانی میں۔ دادا ابا، کوے کیسے بنے؟ یہ وہ سوال تھا جس کے دادا ابا اس کی پیدائش کے وقت سے منتظر تھے۔

چھ سال انہوں نے سوچا کہ اس بچی کہ اس سوال کا جواب کیا ہوگا۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر **Atheist** تھے اور اپنی بہو کے متعلق انہیں ہلکا سا شبہ تھا کہ وہ اس کے روایتی قسم کے جواب دے کر بچی کو صراطِ مستقیم سے ہٹا دیں گی۔ اگر موحّد ہوتے تو خدا کا شکر ادا کرتے کہ اس سوال کے جواب کی سعادت ان کے حصے میں آئی۔ چنانچہ اس مرحلے سے گذرے بغیر انہوں نے تذکرۂ ڈارون میں سے بیان کرنا شروع کیا۔ بیٹا، دراصل زندگی کی ابتداء پانی سے ہوئی پانی سے جانور زمین پر آنا شروع ہوئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے ماحول کے حساب سے اپنے آپ کو تبدیل کرنا شروع کیا اور پھر مختلف جانور بنتے گئے جیسے ڈائنو سار اور کوے۔

دادا ابا ڈائنو سار سے پہلے کیا تھا۔ بچی نے اُٹھ کر ذرا دادا ابا کو ڈرانے کی کوشش کرتے ہوئے تھوڑی بھاری آواز میں پوچھا۔

بھئی ان سے پہلے جانور پانی میں رہا کرتے تھے۔

اور ان جانوروں سے پہلے کیا تھا؟

ان سے پہلے زمین نہیں تھی۔ بیٹا، سب سے پہلے **big bang** ہوا۔ اس کے نتیجے میں زمین، سورج، چاند، ستارے اور دوسری بے شمار چیزیں بنیں۔ انہوں نے اس کے منہ پر آئے ہوئے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

ہاں، یہ تو میں جانتی ہوں۔ علم کی زنجیر کی وہ کڑی اس کے ہاتھ میں آئی جس سے وہ واقف تھی اس لیے زور سے چیخی۔ میں نے **The lost world** کے کارٹون میں **big bang** دیکھا ہے۔ ساتھ ساتھ اس کا ذہن کام کر رہا تھا کہ کس طرح دادا ابا کو مصروف رکھا جائے لیکن صرف اپنے ساتھ۔ اس دوران دادا ابا نے اس کی حوصلہ افزائی

کے لیے کہا، دیکھو بیٹا، جو بھی سوال ذہن میں آئے ضرور پوچھو۔ ہم تمہیں سب بتائیں گے۔

دادا ابا کوّے کیسے بنے؟

ارے بھئی ابھی تو تمہیں بتایا تھا کہ زندگی کی ابتداء پانی سے ہوئی پانی سے جانور زمین پر آنا شروع ہوئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے ماحول کے حساب سے اپنے آپ کو تبدیل کرنا شروع کیا اور پھر مختلف جانور بنتے گئے جیسے ڈائنوسار اور کوّے۔ انہوں نے اس حصہ تقریر کو دوہرایا۔ مجھے معلوم ہے دادا ابا، میں تو یہ پوچھ رہی تھی کہ کوّں سے پہلے کیا تھا؟ دادا ابا ناراض ہوگئے۔ بھئی تم یاد نہیں رکھتی ہو۔ کوّں سے پہلے ڈائنوسار اور ان سے پہلے۔ کہانی پھر شروع ہوگئی۔

اس سارے عرصے کے دوران دیگر اہلِ خانہ خاموش رہے وہ شاید آموختہ کر رہے تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے شوشہ چھوڑا۔ ایسے موقعوں پر اللہ میاں کتنے کام آتے ہیں۔ کوے کیسے بنے۔ اللہ میاں نے بنائے۔ دادا ابا خاموش ہوگئے۔ زندگی کسی اور طرف رواں دواں ہوگئی۔

اسی قبیل کے ایک صاحب اور ہیں۔ فرمانے لگے۔ ارے کس خدا کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ خدا پرستی تو بس عام انسانی ذہن کے کارخانے کی پیداوار ہے۔ ورنہ میرؔ جیسے شاعر کو دیکھیں کہتے ہیں کہ

یہ سب تو ہم کا کارخانہ ہے
یاں وہ ہے جو اعتبار کیا

اور یہ دوسرا شعر دیکھیں جسے ارباب توحید پرست کسی اور طرح بیان کرتے ہیں۔

میرؔ کے دین و مذہب کو پوچھتے ہو کیا، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

لیکن مجھے تو اس شعر سے ہمیشہ یہی خیال آیا کہ وہ اہلِ ہنود میں شامل ہوگئے تھے۔ انہوں نے سر پکڑ لیا اور کہنے لگے۔ O, man۔ یہ تو بالکل کنوئیں کے مینڈک والی بات کی ہے آپ نے۔ پھر شاید میری عزت نفس کے مجروح ہونے کے خیال سے گویا ہوئے کہ ذرا مختلف قسم کی چیزیں پڑھا کریں آپ اس سے وسعت نظری پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔ پھر غالبؔ کے متعلق ارشاد ہوا۔ غالبؔ جیسا عظیم شاعر کہتا ہے۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

چلیے ٹھیک ہے۔ لیکن کیا یہ شعر غالبؔ کا نہیں ہے کہ

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اِک زمانہ مہرباں ہوجائے گا

تھوڑا سا جز بز ہوئے اور کہنے لگا۔ ارے صاحب، تو گویا آپ سمجھتی ہیں کہ یہ شعر غالب کا ہے۔ جی۔ اور جہاں تک میری یادداشت ساتھ دیتی ہے اس کا مقطع ہے۔ جو کہ خاصہ مشہور ہے اور آپ کے کانوں سے ضرور گزرا ہوگا کہ

فائدہ کیا، سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہوجائے گا

کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ میں نے تھوڑا شاعروں کی تلون مزاجی کا ذکر کیا۔ اور سیلاب بلا کا رخ موڑا اور اقبال کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ ان کی آواز دھیمی ہوگئی اور میرے کان کے پاس منہ لا کر گویا ہوئے۔ ارے وہ شاعر کہاں فلسفی ہے اور فلسفی بھی کیا میں تو کہوں گا تبلیغی ہے تبلیغی۔

ایک اور صاحب ہیں۔ جب میں نے ان سے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ خدا گُم ہوگیا ہے۔ تو کہنے لگے۔ مجھے اس سے کیا۔ آپ تو جانتی ہیں کہ میں Agnostic ہوں۔ یعنی متشککین میں سے میرا تعلق ہے۔ خدا کے ہونے نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن کیوں؟ اس قدر لاتعلقیت کیوں؟ میں جھنجھلائی۔ دیکھیں بات دراصل یہ ہے کہ مجھے یہ چیز سخت ناپسند ہے کہ جو چیز آپ کو پسند ہو وہ آپ محض اس لیے نہ کریں کہ خدا کو ناپسند ہے۔ اور میری اکثر پسندیدہ چیزوں کہ ساتھ یہی معاملہ ہے۔ میری ذاتی پسند ناپسند بھی وجود رکھتی ہے۔ پھر انہوں نے گلاس میں قلقل کرتے ہوئے مشروب میں احتیاط سے برف کے ٹکڑے ڈالے۔ آرام کرسی سے ٹیک لگا کر چُسکیاں لینا شروع کیں اور CD پلیئر سے اٹھنے والی بانسری کی مدھر تانوں پر جو چورسیہ کی انگلیوں کا کمال تھیں سَر دھننا شروع کر دیا۔

ایک دن بس میں سفر کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک موٹر سائیکل روڈ کے ایک طرف زمین پر گری ہوئی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک چادر سے کسی کے جسم کو ڈھا کا ہوا تھا۔ اس اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک سفید گوشت سے بنا اور لال رگوں سے ڈھکا ہوا بھیجہ پڑا تھا۔ انسان کا بھیجہ۔ قریب میں کوئی بھی نہ تھا اور آس پاس ساری دنیا اپنے کاموں میں ایسے مصروف تھی جیسے اس روڈ پر کچھ نہیں ہوا۔ جیسے اس بھیجے کو وہ پہچانتے ہی نہ ہوں اور جیسے اس سے ملتی جلتی چیز ان کے پاس نہیں ہے۔ اس سے دو اسٹاپ آگے ٹریفک سگنل بند تھا شاید کام نہیں کر رہا تھا۔ گاڑیاں مختلف سمتوں سے آ کر چوراہے پر پھنس گئی تھیں اور دو ٹریفک کانسٹیبل تھوڑے فاصلے پر کھڑی منی بس کے ڈرائیور سے مک مکا کر رہے تھے۔ خیر یہ تو روز کا منظر ہے۔

مطلوبہ بس اسٹاپ پر میں اُتر گئی اور گھر کی طرف چلی تو جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک نوجوان میرے قریب آیا اور میرے پرس پر ہاتھ مارا اور لے کر اڑن چھو ہوگیا۔ میں اپنے شناختی کارڈ، لائسنس، موبائل فون، اکثر کا اپائنٹمنٹ کارڈ، پیسے اور اسی قبیل کی دوسری اشیاء سے بیک جنبش باز و محروم ہوگئی۔

ساری چیزیں ایک طرف قومی شناختی کارڈ کا دوبارا بنوانا، کوہستوں سے جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ پہلے مرحلے میں، مَیں تھانے میں رپورٹ درج کرانے گئی تو رپورٹ لکھنے والا پولیس مین کہنے لگا۔ وہ سانولے سے رنگ کا لمبا سا، دبلا پتلا لڑکا تو نہیں تھا۔ جس کی دائیں آنکھ پر چوٹ کا نشان ہے اور جس کی مونچھیں بھی ہیں۔ مجھے خاصی حیرانی ہوئی۔ کمال ہے آپ کو کیسے پتہ۔ جی، یہ سارے چورا چکے ایسی ہی شکلوں کے ہوتے ہیں۔ اچھا تبھی پکڑے نہیں جاتے اور جب پکڑے جاتے ہیں تو ایک ڈھیر جمع ہو جاتا ہے۔ ارے یہ اندازہ لگانا چاہ رہا ہے کہ کون تھا کہ اپنا حصہ وصول کر سکے۔ میرے ساتھی نے سرگوشی کی۔ اوہ، اچھا۔

رپورٹ درج کرانے کے بعد میں اٹھی اور پھر بیٹھ گئی۔ ایک اور رپورٹ نہ درج کرادوں۔ خدا کی گمشدگی کی۔ لیکن شک کس پر ظاہر کروں گی۔ پھر خیال آیا کچھ دن اور انتظار کر لیتی ہوں اگر انہوں نے میرا پرس بمعہ سامان تلاش کر لیا تو پھر ان مہم پر بھی لگادوں گی۔ تا اطلاع ثانی۔ ہنوز دلی دوراست۔

کچھ دنوں پہلے ایک خاتون کہنے لگیں کہ آپ کو بڑی تشویش رہتی ہے آج کل کہ خدا گم ہو گیا ہے۔ بھئی کسی سگنل پر تھوڑی دیر کے لیے گاڑی رکے تو میں دیکھتی ہوں کہ ہر طرف اللہ ہی اللہ ہوتا ہے۔ یہ تو استعمال ہے۔ میں تو اصل چیز کی بات کر رہی ہوں۔ سمجھیں آپ۔

اس سارے چکر میں ایک دن جب کہ کراچی میں شدید گرمی اور لُو کے تھپیڑے چل رہے تھے۔ میں نے صبح جب اپنے آسٹریلین طوطوں کے پینے کا پانی بدلنا چاہا تو پتہ چلا کہ طوطوں کی دو کنڈیوں میں جن میں بچے تھے۔ ان میں سے ایک کے والدین دونوں مرچکے ہیں۔ اور دوسرے کی مادہ نہیں رہی تھی۔ جن بچوں کی ماں نہیں تھی ان میں تو نر اپنی ذمے داری پوری کر رہا تھا یعنی ان کی بڑی ضرورت غذا انہیں بہم پہنچا رہا تھا اور دل پشوری کے لیے وقتاً فوقتاً ان سے گفتگو بھی کرتا رہتا مگر جن کے والدین نہیں رہے تھے۔ ان کی دیکھ بھال ایک مسئلہ تھی۔ پہلے دن تو میں نے انہیں دو دو گھنٹے کے وقفے سے باہر نکالا باجرہ کوٹا اور اس میں پانی ملایا اور ان کی چونچوں کو ہاتھ سے کھول کر ان کے منہ میں ڈالا۔ اس دوران وہ مسلسل چوں چوں کرتے رہے۔ میں ان کی چونچوں کی چبھن اپنی انگلیوں پر محسوس کرتی مگر یہ اس سے بے حد کم تھی جو میرے دل میں ان کے لیے تھی۔ ہر دفعہ کھانا کھلانے کے بعد انہیں پنجرے میں واپس پہنچا دیتی۔ تا کہ وہ اپنے ماحول میں رہیں۔ ایسا کرنے کے دوران اندر کی آبادی چوکنا ہو کر اِدھر اُدھر اڑنا شروع کر دیتی۔

یہ خاصہ ذمے داری کا کام تھا اور میں پریشان تھی کہ اب کیا ہوگا۔ ابھی تو ان کے پَر آنے میں زمانہ لگے گا۔ اگلی صبح اس پریشانی میں اُٹھی۔ پہلے اپنے بچوں کو ناشتہ کرا کے اسکول اور میاں صاحب کو آفس روانہ کیا اور پھر پکن کو اسی افراتفری کی حالت میں چھوڑ کر پنجرے کی طرف گئی۔ وہاں نظر ڈالتے ہی مجھے خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا۔ وہ نر طوطا جس کی مادہ مرچکی تھی وہ ان بچوں کو دانہ کھلا رہا تھا جن کے والدین گزر چکے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے

سوچا یہ شاید بھول گیا ہے کہ اس کی کنڈی کون سی ہے اور اس کے بچے کون سے ہیں۔ مگر میری یہ سوچ غلط تھی۔ وہ اڑ کر جاتا اور ایک دفعہ اپنے بچوں کے منہ میں دانہ ڈالتا اور دوسری دفعہ ان یتیم و مسکین بچوں کا پیٹ بھرتا۔ قدرت نے اپنا راستہ تلاش کر لیا اسے میری مداخلت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ میں کوئی تحقیق داں تو نہ تھی کہ سوچتی کا یہ سب کچھ کیا کچھ خامروں (Enzymes) کی فعالیت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر ایسا ہے تو کس چیز نے ان کو فعال کر دیا، نہ ہی میں کوئی سماجی سائنسداں ہوں جو غور فرماتی کہ کیا پرندے بھی ضمیر رکھتے ہیں؟ کیا ان کا بھی کوئی اخلاقی نظام ہے؟ یہ اخلاقی نظام کس لیے وجود میں آیا؟ کیا پرندوں کو اپنے نظام میں میری بار بار کی مداخلت بُری لگی۔ میں کیا جانوں، میں ٹھہری ایک عام عورت، میں نے سوچا کچھ لوگ شاید ٹھیک کہتے ہیں خدا شاید یہی کہیں ہے مگر اب اس نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے۔ یا شاید وہ سمجھتا ہے کہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دینا چاہیے یا پھر وہ ناراض ہے۔ ان سارے خیالات کو اسی پنجرے کے پاس چھوڑ کر میں اپنے پنجرے میں واپس آ گئی۔

یہ مسئلہ شاید اسی طرح چلتا رہتا۔ مگر میری اپنی تین سالہ بچی مجھے اس جمود سے واپس لے آئی۔ وہ ایک دن اپنے مونٹیسوری اسکول سے واپس آئی تو گھر کے اندر داخل ہوتے ہی نہ سلام نہ دعا۔ بھاگتے ہوئے اس نے مجھے تلاش کیا اور اس دوران چیختی رہی۔ اماں، اماں کہاں ہیں آپ۔ اور پھر دیکھتے ہی پھولی سانسوں کے درمیان کہنے لگی اماں، پتہ ہے آج میں نے اللہ میاں کو دیکھا؟ اچھا کہاں؟ میں بس میں بیٹھی تھی اور وہ گلی سے جا رہے تھے۔ اچھا، پیدل جا رہے تھے۔ نہیں اماں، سائیکل پر بیٹھے تھے۔ اوہ۔ اچھا، کیسے لگ رہے تھے۔ بہت اچھے لگ رہے تھے اماں۔ میں اب تک الجھن میں تھی کہ آخر کیا دیکھ لیا ہے۔ اماں انہوں نے سفید کپڑے پہنے تھے اور سر پر ٹوپی تھی سفید رنگ کی اور ان کی داڑھی تھی سفید رنگ کی۔ اور وہ سائیکل چلا رہے تھے، یا خدا، میرے گھر کے کلین شیو مردوں میں ایسا اللہ میاں کہاں سے آ گیا۔ مَیں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ جوش میں تھی جان لینے کی خوشی سے۔ اماں، پتہ ہے میں نے ان کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو وہ ہنسے بھی تھے۔ یہ سُن کر مَیں بھی ہنس دی۔ بس بہت تیز تھی ناں۔ اللہ میاں پیچھے رہ گئے۔ میں نے انہیں نہیں دیکھا۔

❀❀

Address:
C-57 Block II, Fedreal B Area
Karachi : 75950 (Pakistan)

کرشن کمار طور

غزل

گماں سمجھتے تھے جس کو وہی یقیں دیکھا
یہ اک طلسم بھی ہم نے کہیں کہیں دیکھا

پڑا ہوا ہوں میں سجدے میں فرطِ حیرت سے
وہ کہہ رہا ہے کہ مجھ سا کوئی حسیں دیکھا

یہ معجزہ بھی ہمارے ہی ساتھ ہونا تھا
اسے جو دیکھا تو پھر ہم نے کچھ نہیں دیکھا

کچھ اس طرح بھی نکالی ہے اپنی کثرتِ شوق
اس آستاں کو بہت صورتِ جبیں دیکھا

دفینہ درد کا دل سے کہیں سنبھلتا ہے
نکالنے سے زیادہ یہ تہہ نشیں دیکھا

ہزار بار گئے آسماں بلندی تک
ہر ایک بار سفر جانبِ زمیں دیکھا

خدا سمجھ کے اسے پوجتا رہا ہوں طورؔ
ہے کتنے درجہ مکمل مرا یقیں دیکھا

❁❁

غزل

یہ کیا ہوا ہے کیوں آتے نہیں شمار میں ہم
کہاں نہیں ہیں کہاں ہیں ترے دیار میں ہم

ہے کیسا وقت کہ پہچانتے نہیں خود کو
خدا ہی جانے کہ ہیں کون سے خمار میں ہم

یقیں جو ہو تو ایسا ہو بے یقینی کا
کہ خود کو کرتے نہیں اب کسی شمار میں ہم

یہ ہجر و وصل تو بے شک اضافی باتیں ہیں
نہ اب ہیں اس کے نہ اب اپنے اختیار میں ہم

اسے تو ویسے بھی ضائع جہاں میں ہونا تھا
جو عمر کاٹ چکے اس کے انتظار میں ہم

تمام منظرِ امکاں بدلنے والا ہے
یہ کیسے کہتے ابھی تک ہیں رہگذار میں ہم

ہمارے ہجر کی منزل نہیں ہے دور اب طورؔ
چمک رہے ہیں بہت عشقِ بے کنار میں ہم

❁❁

Address:
134-E, Khanyara Qord
DHARAM SHALA : 176215
(H.P.) INDIA

عین سلام

غزل

یہ جہانِ خیر و شر ہے رائیگانی کے لیے
دل ترستے ہیں ذرا سی مہربانی کے لیے
ہول ناکی سے کہیں کوئی زمیں خالی نہیں
اب کہاں جائے اماں نقلِ مکانی کے لیے
رزق پر کردی گئی موقوف ہستی کی اساس
کم نہیں کچھ یہ گرانی سرگرانی کے لیے
ہر طرف جاری یہ کیسا کھیل ہے اضداد کا
پیش ہے جس میں حقیقت خود کہانی کے لیے
اک ذرا سی دیر کو خود میں سمٹ کر دیکھ لو
دل سے بڑھ کر اور کیا ہے بے کرانی کے لیے
اک عجب حسنِ حقیقت ہے محیط کائنات
لفظ خود حیران ہیں شرحِ معانی کے لیے
خواب میں تحلیل ہوتے دیکھ کر عمرِ عزیز
کہنہ سالی میں مزے ہم نے جوانی کے لیے
کاش اسے اس دشت میں حاصل ہو سیرابی سلام
جو سرابوں کی طرف جاتا ہے پانی کے لیے

❁❁

Address:
C/o 24-A, Chaman, Housing Scheme
QUETTA (Baluchistan)

غزل

زندگی زندگی ہے خواب نہیں
یہ حقیقت کوئی سراب نہیں
کائنات اک صحیفہ ایسا ہے
جس سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں
کچھ تو ان کے سوا بھی ہوتا کاش
خیر و شر حسنِ انتخاب نہیں
مطمئن کیوں سمجھ رہے ہو اسے
جو بظاہر پُر اضطراب نہیں
خود سے ملنے میں صرف اپنے سبب
کوئی بھی شخص کامیاب نہیں
بیش و کم کچھ نہیں محبت میں
یوں سمجھ لو کوئی حساب نہیں
کم نہیں ہیں سراب دریا میں
سرِ صحرا کہیں حباب نہیں
اس نے پوچھا کبھی جو میرا حال
ہنس کے کہنا پڑا خراب نہیں
عمر آخر گزار دی تنہا
اے سلام آپ کا جواب نہیں

❁❁

نذیر قیصر

غزل

جب سب کچھ ڈھ جاتا ہے
کچھ نہ کچھ رہ جاتا ہے
جو کچھ کہا نہیں جاتا
سناٹا کہہ جاتا ہے
جو کچھ دینا ہوتا ہے
جیبوں میں رہ جاتا ہے
تم سے بچھڑ کے سوچتا ہوں
دل کیا کیا سہہ جاتا ہے
دن کے خالی پیالے میں
آسمان رہ جاتا ہے
قیصر ریت کے پیروں میں
مشکیزہ بہہ جاتا ہے

❁❁

Address:

اقبال فریدی

غزل

کارِ وحشت سبھی کرے ہوئے ہیں
اب محبت سے ہم ڈرے ہوئے ہیں
اے فلک اے ستم طراز ہمیں
اور مت مار ہم مرے ہوئے ہیں
جسم پتھر ہے اس کا دل پتھر
چھو کے پتھر کو ہم پرے ہوئے ہیں
چشم میگوں ہے یا کہ اشکوں سے
دو پیالے بھرے بھرے ہوئے ہیں
ان دکانوں پہ بکنے آئے جہاں
کھوٹے سکے بھی اب کھرے ہوئے ہیں
طاق ابرو کے سائے میں آنکھیں
نسخہ ہائے وفا دھرے ہوئے ہیں
سب مضامین ہائے نکتہ طراز
اسپ ہائے سخن چرے ہوئے ہیں
جاتی عمروں میں اوّلیں دن کے
زخم دوبارہ کیوں ہرے ہوئے ہیں

❁❁

Address:
Station Director Radio Pakistan Karachi.

خواجہ منظر حسن

غزل

زخم پر رکھتے بھی وہ پھاہا تو کیا
آگ پر ہو ابر کا سایا تو کیا
تابشِ قلب و نظر گہنا گئی
اب اگر سورج بھی گہنایا تو کیا
مسخ جب صورت ہی اپنی ہوگئی
آئینہ پتھر سے ٹکرایا تو کیا
عمر بھر سائے کو ہم ترسا کیے
قبر پر برگد کا ہے سایا تو کیا
جب نہیں باقی روابط میں خلوص
بھائی بھی ہو کوئی ماں جایا تو کیا
سنگِ در پر ہی رہی کائی جمی
گر پلٹ دی شہر کی کایا تو کیا
جسم کو چھوتے ہی بن جائیں گے پھول
سنگ دل سے سنگ برسایا تو کیا
چاند کا چہرہ تو تھا خود داغ دار
چاند سے انسان ہو آیا تو کیا
کوئی منظؔر آپ سے ناخوش نہیں
ہے اگر ناراض ہمسایا تو کیا

❁❁

غزل

دیکھنے میں جانے ہے کتنے برس کا فاصلہ
ہے مگر مہد و لحد میں اک نفس کا فاصلہ
اُٹھ کے ماں کی گود سے آئے زمین کی گود تک
ایک لمحہ ہے اصل کی دسترس کا فاصلہ
تن کی آزادی میں حائل ہیں نفس کی تیلیاں
کیا قفس اندر سے بیرون قفس کا فاصلہ
پھیل جاتی ہے جہاں کی تیرگی میں روشنی
دور ہو جاتا ہے جب گل سے مگس کا فاصلہ
یونہی گر پہنائی حرص و ہوا بڑھتی رہی
اور بھی گھٹ جائے گا نفس و نفس کا فاصلہ
جا ملیں گے قافلہ والوں سے آگے تو بڑھیں
گوش شنوا سے نہیں بانگِ جرس کا فاصلہ
فرقہ بندی ہو جو مسجد میں تو کیوں باقی رہے
گنبد مسجد سے مندر کے کلس کا فاصلہ
خلق کی قربت بھی بڑھتی ہے خدا کے قرب سے
ایک کی قربت سے گھٹ جاتا ہے دس کا فاصلہ
ہم مٹا سکتے ہیں منظؔر امتیاز رنگ و نسل
زیر و بالا، پست و ارفع پیش و پس کا فاصلہ

❁❁

Address:
A-3, Sector II-B
North Nazimabad, Karachi.

غلام حسین ساجد

غزل

پلٹ سکو جو کسی طرح گھر کو میری طرح
تو ساتھ ساتھ رکھو شور و شر کو میری طرح

اسے بھی چھو نہ سکے گی ہوائے رنگِ طرب
جو وہ بھی تازہ رکھے زخمِ سر کو میری طرح

نکل سکے نہ کسی راستے پہ بے کھٹکے
جو ڈھونڈتے تھے کسی ہم سفر کو میری طرح!

نہ خاک اڑائی ہے اس نے نہ آنکھ ہی نم کی
گنوا چکا ہے کہیں خشک و تر کو میری طرح

کہاں نصیب ہوئی منزل مراد اسے
وہ ناپتا ہے ابھی بحروبر کو میری طرح

چراغ کوئے نگاراں، زرِ جمال خواب
عطا ہوئے ہیں کسی بے بصر کو میری طرح

نثار ہونے لگے ٹہنیوں پہ برگ و بار
کہ پیار آیا ہے خود پہ شجر کو میری طرح

اسیرِ شمس جہاں تاب کو کیا اس نے
ادائے صبر سکھا کر نظر کو میری طرح

ملے گی ایک نئی زندگی تمہیں ساجدؔ
اگر نکال سکو دل سے ڈر کو میری طرح

❁❁

غزل

رونق ترے کوچے کی کبھی کم نہیں ہوگی
یہ بزمِ نگاراں ہے جو برہم نہیں ہوگی

یکتا ہوں تو یکتا ہی رہوں گا میں ہمیشہ
وہ ذات مری ذات میں مدغم نہیں ہوگی

رہتا ہے بہت اپنے جنوں پر مجھے قابو
دل راکھ بھی ہو، آنکھ مگر نم نہیں ہوگی

رکھی ہے نہ رکھوں گا کوئی دہر سے نسبت
معلوم ہے دنیا مری ہم دم نہیں ہوگی

اک آہ جو اٹھتی ہے مرے خواب کدے سے
کیا سحر دعا سے بھی مجسم نہیں ہوگی؟

اٹھتی نہیں اک گاؤں کی جانب مری آنکھیں
کیا شہر میں رہنے کی ہوس کم نہیں ہوگی؟

کب تک مجھے پہچان نہ ہوگی مری ساجدؔ
کب تک مری ہستی مری محرم نہیں ہوگی

❁❁

Address:
280 Raqa Block
Allama Iqbal Town
LAHORE : 34576
(PAKISTAN)

صابر ظفر

غزل

ہم آدمی تھے ہمیں خاک دھول ہونا تھا
رسول ہوچکے، جن کو رسول ہونا تھا
بس ایک رسم تھی ہم نے اٹھا لیے تھے ہاتھ
دعا نہ کی تھی وہ جس کو قبول ہونا تھا
کوئی نشاط کی صورت تلاش کرنا تھی
اور اس تلاش میں پیہم ملول ہونا تھا
وہ تتلیاں ہی نہیں تھیں تو سوچتے کیا ہم
بہار آنا تھی اور ہم کو پھول ہونا تھا
سبیل حکمتِ معلوم کھوچکی تو ظفؔر
کسی کتاب کا پھر کیا نزول ہونا تھا

❁❁

غزل

اڑا کرتے تھے جو اپنی ہوا میں،
سمٹ کرُ رہ گئے ہیں نقشِ پا میں
رہیں گے اول و آخر اُسی کے
یہ ہم نے کہہ دیا تھا ابتدا میں
نہیں جن کو کسی منظر سے رغبت
وہ غارت کر رہے ہیں اپنی شامیں
خدا جانے، وہ ہیں مغموم کتنے
کشش پاتے نہیں جو دلربا میں
سنا ہے رنگ ہے کچھ آخرت کا
ظفؔر اس دہر کی عبرت سرا میں

❁❁

Address:
Publication Sector
Information Department
Block 84, Govt. of Sindh
Karachi.

یعقوب تصور

غزل

یقیں کی انتہا پر بھی یہ اندازِ گماں رکھنا
ہے مجبوری سدا اپنے سروں پر آسماں رکھنا

جہاں لمحہ بہ لمحہ زلزلوں کا ہو عمل جاری
وہاں کیا پُر سکوں رہنا وہاں کیسا مکاں رکھنا

نہ دنیا کا کوئی خواہاں نہ خواہشمند امبر کا
سو ہے خود کو زمین و آسماں کے درمیاں رکھنا

چھپائے اپنے دامن میں بپھرتی آندھیوں سے ہوں
کوئی بتلاء ئے لرزیدہ دیا ہے اب کہاں رکھنا

نظام مصلحت یہ بھی تو اک آتش زنوں کا ہے
کہ شعلے تو بجھا دینا مگر قائم دھواں رکھنا

سفر کا عزم مستحکم تو منزل کھینچ لیتی ہے
نہ کوئی قافلہ لازم نہ میرِ کارواں رکھنا

تصوّر میں اسی کے زندگی کے دن گزرتے ہیں
نہیں جس کی خوے ایذا رسائی میں کماں رکھنا

❀❀

Address:
Post Bux # 4628, ABUDHABI (U.A.E.)

غزل

حسن کی دائم جمال آرائیاں
وقت کی قائم کمال آرائیاں

کوئی آئے یا نہ آئے انتظار
زندگانی کی وصال آرائیاں

ایک مدت بعد حاصل اتصال
اور ہونٹوں پر سوال آرائیاں

علم کا فقدان ہے دانش کا قحط
مسئلوں پر ہیں خیال آرائیاں

انتہا یوں تو بلندی کی نہیں
مستند تو ہیں زوال آرائیاں

زندگی پیہم تگ و دو کا نظام
بے مالی میں مآل آرائیاں

گفتگو فطرت کی غمازی کا فن
بے صدائی احتمال آرائیاں

اب تصوّر لے نہ ڈوبیں ہی کہیں
بے زری میں خوش خصال آرائیاں

❀❀

صادق مدہوش

غزل

میں ہوں وہاں جہاں پہ یہ ساماں ہیں میرے پاس
حوریں ہیں ارد گرد تو غلماں ہیں تیرے پاس

کچھ چاہیے حضور کو سرکار حکم ہو
ہر لحجہ صف بہ صف نئے درباں ہیں میرے پاس

سوتے ہوئے بھی خواب میں گر میرے لب ہلیں
تعبیر کے تمام ہی امکاں ہیں میرے پاس

کچھ نو بہار ناز غزل خواں ہیں اس طرح
لگتا ہے جیسے نزدِ رگِ جاں ہیں میرے پاس

نیر نگئ حیات کا ہے رقص چارسو
ہر سمت کچھ نقوش گریزاں ہیں میرے پاس

کچھ دیکھی بھالی صورتیں کچھ آشنا سے لمس
کچھ لوگ بال کھولے پریشان ہیں میرے پاس

میں کون ہوں کہاں ہوں مجھے کچھ خبر نہیں
کیوں لوگ اس طرح سے ہراساں ہیں میرے پاس

❁❁

غزل

اتنی مانوس ہے مجھ سے شبِ تنہائی مری
کہتی ہے پچھلا پہر ختم ہوا سوجاؤ

وہ نہیں آئے گا اب راہ نا دیکھو اس کی
دور و نزدیک نہیں کوئی صدا سوجاؤ

کب تلک جاگو گے اور کس کے لیے جاگو گے
جانے والا تو بہر حال گیا سوجاؤ

دل تو نادان ہے کیوں سنتے ہو اس کی باتیں
تم سمجھدار ہو کیا تم کو ہوا سوجاؤ

ایسے موسم میں بھلا گھر سے نکلتا ہے کوئی
گھر چلو چلنے لگی تیز ہوا سوجاؤ

❁❁

Address:
B-123, Sindh Muslim
Housing Suciety
KARACHI.

شہلا نقوی

غزل

سحاب آرزو اب کون رویا
یہ اس کے روبرو اب کون رویا
مری آنکھیں تو اب صحرا صفت ہیں
یہ دریا، آبجو اب کون رویا
یہ مردہ بستیاں کس کی ہیں جاگیر
یہ آنکھوں سے لہو اب کون رویا
زباں بندی ہمارا طور ٹھہری
بنامِ گفتگو اب کون رویا
یہ دریا راستہ اپنا بدل دے
یہ کرکے جستجو اب کون رویا
یہاں سچائی کس کو بھائی ہے
یہ ایں شور غلو اب کون رویا
تھا بے قیمت سا اک مٹی کا پیالہ
پٹخ کر وہ سبو اب کون رویا
شگوفے تو بہت ارزاں یہاں تھے
مٹا کر رنگ و بو اب کون رویا
یہ دنیا قحبہ خانہ ہے یہاں پر
قلم کی آبرو اب کون رویا
ہزاروں داستانیں جن کو شہلا
سنا کر کو بکو اب کون رویا۔

❀❀

Address:
15 Daniels, White Planes
New Yourk : 10604-2303
(U.S.A.)

امجد اسلام امجد

غزل

اوجھل سہی نگاہ سے، ڈوبا نہیں ہوں میں
اے رات ہوشیار کہ ہارا نہیں ہوں میں
خوابوں کی سبز دھند سی اب بھی ہے ہر طرف
لگتا ہے یوں کہ نیند سے جاگا نہیں ہوں میں
گرمی مرے شعور کی دیتی ہے مجھ کو شکل
قسمت کے سرد ہاتھ کا لکھا نہیں ہوں میں
درپیش صبح و شام ہے اب یہ ہی کشمکش
اس کا بنوں میں کیسے کہ اپنا نہیں ہوں میں
اک حرفِ رائگاں سہی مانا مرا وجود
کیسے کہوں کتاب کا حصہ نہیں ہوں میں
مجھ کو فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں مگر
جتنا بُرا سمجھتے ہو اتنا نہیں ہوں میں
اس طرح پھیر پھیر کے باتیں نہ کیجیے
لہجے کا رُخ سمجھتا ہوں بچہ نہیں ہوں میں
میری تو بات بات کی شاہد ہے کائنات
دل سے گھڑا ہوا کوئی قصہ نہیں ہوں میں
دیکھی ہوئی سی لگتی ہے ہر رہ گزار کیوں
ان راستوں سے پہلے تو گزرا نہیں ہوں میں!
دل کو گواہ کرکے لکھا جو بھی کچھ لکھا
کاغذ کا پیٹ بھرنے کو لکھتا نہیں ہوں میں
ممکن نہیں ہے مجھ سے یہ طرزِ منافقت
دنیا ترے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں
امجد تھی بھیڑ ایسی کہ چلتے چلے گئے
کچھ بھی یہاں پہ دھیان سے "دیکھا نہیں ہوں میں"

❀❀

Address:
275-N DHA. LAHORE

عصمت دُرّانی

غزل

جب اس نے بات بڑھائی تو بحث کی میں نے
وہ چپ ہوا تو زباں کو لگام دی میں نے
قدم قدم پہ نئے قصّہ گو ملے مجھ کو
قدم قدم پہ نئی داستاں سنی میں نے
کھلا کہ حلقۂ احباب معترف ہے مرا
کسی نے داد نہ دی جب غزل پڑھی میں نے
بھسم کرے گی پشیمانیوں کی آگ مجھے
اگر عدو کی اطاعت قبول کی میں نے
کسی کو میں نے بھی آواز دی مدد کے لیے
مگر جواب میں اپنی صدا سنی میں نے
جب اس سے ہاتھ ملایا تو اور کچھ نہ کہا
بس ایک شرطِ وفا درمیاں رکھی میں نے
نہیں تو مجھ سے بھلا کون جیت سکتا ہے
تری خوشی کے لیے ہار مان لی میں نے

❀❀

غزل

ایک ٹھوکر نہ سہہ سکی دیوار
اپنے قدموں پہ آگری دیوار
کتنی شدت تھی اس دھماکے میں
دیر تک ڈولتی رہی دیوار
ایک ریلا کہیں سے آیا تھا
پھر نجانے کہاں گئی دیوار
کیا یہ در ہے اسی حویلی کا
کیا یہ دیوار ہے وہی دیوار
میں نے روزن بنالیا اس میں
جب بھی رستے میں آگئی دیوار
کون سورج کو دیکھ سکتا ہے
روشنی خود ہے بیچ کی دیوار
ہے اُفق پر لکیر سی کوئی
کیا بیاباں میں آگئی دیوار

❀❀

Address:
C/o 24-A, Chaman
Housing Scheme
QUETTA (Baluchistan)

قوس صدیقی

غزل

وہ جتنا چاہیں کرلیں قدم کے نشاں شمار
ہم ہو نہیں سکیں گے کبھی رائیگاں شمار
کس کا کہاں شمار ہے اپنا کہاں شمار
مٹھی میں کرکے دیکھیے سارا جہاں شمار
کس کو قرار دے گا ابھی بیچ کا ورق
اوراق زندگی نہ کر انگشتِ جاں شمار
ہر غم کو زندگی کی علامت کہاں نصیب
ہر چیخ ہو بھی سکتی نہیں ہے بیاں شمار
سانسوں کی الگنی پہ رہا ہوں کچھ اس طرح
لمحوں کی کشتی کرنے لگی باد باں شمار
کچھ تو ملے گمان کو "خاکاگ" کا ثبوت
شعلہ نہیں تو خود کو دکھا دو "دھواں شمار"
اک گرد گرد حاشیے پر لکھ رہا ہوں قوسؔ
شاید کہ وہ ورق ہو کبھی داستاں شمار

❁❁

غزل

خالی نہیں اٹھی کبھی "ادراک پالکی"
کاندھوں پہ چڑھ کے جب بھی چلی "خاک پالکی"
گردش میں جب بھی پھانکتی ہے خاک پالکی
کتنی دلہن تراشتی ہے "چاک پالکی"
پائے گی خود کو ایک سہاگن کے روپ میں
اے زندگی! تو چل کے ذرا تاک پالکی
ہر در کو چوم آئی ہیں پیاسی ضرورتیں
کیا کیا نہ کہہ رہی ہے یہ "بے باک پالکی"
دشت برہنگی میں "حیا لطف" اب کہاں
کاندھوں کو جب ترس گئی "پوشاک پالکی"
لوٹا ہے اہل شانہ نے "بی بی" کا بانکپن
مجبورِ محض! ڈھوئیے ناپاک پالکی
بیٹھے ہیں یوں تراشنے سنگِ نوا کو قوسؔ
بھر جائے گی ستاروں سے "شب ناک" پالکی

❁❁

Address:

MOH - MAHATWANA
PHULWARI SHARIF,
PATNA - 801505 (BIHAR) INDIA

حسیر نوری

غزل

احتساب اپنا بہ انداز دگر رہتا ہے
دوستو سامنے آئینہ اگر رہتا ہے
ہم نے گلشن میں عجب شعبدہ بازی دیکھی
زرد موسم میں بھی کیا تازہ شجر رہتا ہے
کارواں سوچ کے رہتے ہیں مسافت میں سدا
میں تو گھر میں ہوں مگر جاری سفر رہتا ہے
ہے سفر جذبۂ اخلاص سے معمور کہاں
صرف منزل کا نشاں پیش نظر رہتا ہے
مجھ سے ملنا کوئی چاہے تو صدا کھل کے دے
میں کہاں رہتا ہوں اور ذہن کدھر رہتا ہے
مجھ سے بڑھ کر ہے کہاں کوئی بھلا میرے سوا
میرے ہمراہ مرا زخم جگر رہتا ہے
شام کو دھوپ اترتی ہے تو ڈرتا ہوں حسیرؔ
مجھ کو اندیشۂ ارباب ہنر رہتا ہے

❁❁

غزل

اپنے ہونے کا یقیں مجھ کو کہاں ہوتا ہے
آگ ہوتی ہے کہاں پھر بھی دھواں ہوتا ہے
ظلم کرتا ہوں یہی سوچ کے خود پر اکثر
مجھ میں مجبوری کا احساس نہاں ہوتا ہے
سہتے جاتے ہیں ہر ایک ظلم و ستم کو چپ چاپ
جانتے سب ہیں کہ اک جبر یہاں ہوتا ہے
حادثہ شکل بدل کر بھی مرے ساتھ رہا
شہرِ آشوب میں آرام کہاں ہوتا ہے
کوئی نہ کوئی خرابی تو ہر اک شخص میں ہے
جھوٹ جو بولتا ہے اس کا زیاں ہوتا ہے
ہجر اور وصل کی خواہش سے ہوں بالکل آزاد
جانتا ہوں مرا محبوب کہاں ہوتا ہے
منہ میں جو آتا ہے کہہ دیتا ہے وہ سب کو حسیرؔ
لب پہ جو اس کے ہے، وہ دل میں نہاں ہوتا ہے

❁❁

Address:
B-III, Mustafa Abad,
Malir City
KARACHI : 75050

کاوش عباسی

غزل

تنکا ایک سلاخ بھی ثابت ہوسکتا ہے
وہم تمہارا تمہیں لہو میں ڈبو سکتا ہے
دیکھ اے زیادہ باہر گھومنے پھرنے والے
تیرا زر جوہر بازار میں کھو سکتا ہے
وہ سب پرچم پھاڑتے جاتے بھی ہیں تو کیا
اک پرچم بھی بچا تو اُجالا ہوسکتا ہے
سوچتا ہوں یہ چیتھڑے چیتھڑے آدم زاد
اپنے اندر کتنی سزائیں سمو سکتا ہے
اُفق بجھا تو ٹھوکریں ہی مہمیز قدم ہیں
کوئی تارہ اب مشعلِ رہ نہیں ہوسکتا ہے
دل اک مجلس گاہ ہے یاد کے رنج بروں کی
کوئی جھونکا، کوئی پل میری آنکھ بھگو سکتا ہے

❁❁

Address:
312 Mehran Apartment
Plot 12, ST-1, Bath Island
Clifton, KARACHI

سحر علی

غزل

کوئی دشمن نہیں ہوتا بُرے حالات کے پیچھے
کوئی اپنا ہی ہوتا ہے کسی بھی گھات کے پیچھے
تجھے معلوم ہے گوری کہ بارش کیوں ہوئی اس دن
کوئی اشکوں سے رویا تھا تیری بارات کے پیچھے
فقط اتنا کہا تھا نا ہمیں تم سے محبت ہے
ہماری جان لوگے کیا اب اتنی بات کے پیچھے
شکستِ فاش دشمن نے ہمیں ایسے نہیں دی
تمہارا ہاتھ لگتا ہے ہماری مات کے پیچھے
بھنور سے اپنی کشتی کو بھلا کیسے بچا لاتی پیچھے
دعا کوئی تو ہے مرے دن رات کے پیچھے
سحر اس راز سے دنیا ابھی واقف نہیں شاید
نئی سازش پنپتی ہے نئے حالات کے پیچھے

❁❁

Address:
R-166, 15A3 Buffer Zone
North Karachi.

صابر عظیم آبادی

غزل

سب سے پہلے پیام اُلفت دو
پھر اسے سوچنے کی مہلت دو
جن کا کوئی نہیں زمانے میں
دل سے چاہو انہیں محبت دو
تنگ ظرفی نہیں علامتِ خیر
اپنی سوچوں کو تھوڑی وسعت دو
ہو صداقت بیان میں جس کے
اس کو اظہار کی جسارت دو
بات آپس کی کل بھی کرلیں گے
ہو چلی صبح اب اجازت دو
دن جدائی کے ختم کب ہوں گے
مجھ کو آکر کوئی بشارت دو
اپنے ہاتھوں کے لمس سے صابر
برف کے جسم کو حرارت دو

❀❀

Address:
House # 707, Sector 1
Mojeed Colony, Landhi
Karachi. 22

عبدالاحد ساز

غزل

طبعِ حساس میری خوار ہوئی جاتی ہے
بے حسی عشرت کردار ہوئی جاتی ہے
کچھ تو سچ بول کہ دل سے یہ گراں بوجھ ہٹے
زندگی جھوٹ کا طومار ہوئی جاتی ہے
اور باریک کیے جاتا ہوں میں موئے قلم
تیز تر سوزنِ اظہار ہوئی جاتی ہے
جادۂ فن سے گزرنا بھی کشاکش ہے تمام
راہ خود راہ کی دیوار ہوئی جاتی ہے
سوچ کی دھوپ میں جل اڑنے کو جی چاہتا ہے
سایۂ لفظ سے بھی عار ہوئی جاتی ہے
زیست یوں شام کے لمحوں سے گزرتی ہے کبھی
خود بہ خود شرح غم یار ہوئی جاتی ہے
کم سے کم پھونک ہی دے بجھتی ہوئی راکھ میں ساز
آخری سانس بھی بے کار ہوئی جاتی ہے

❀❀

Address:
Abdul Ahad Saaz
Mohd. Haji Adam and Co.
84, Chakla Street
Mumbai 400003 (India)

فہیم جاوید

غزل

رستے کٹتے جاتے ہیں
منظر ہٹتے جاتے ہیں
البم اگلے وقتوں کے
گرد سے اٹتے جاتے ہیں
کچھ دیوانے، جھوٹے قصے
ہر دم رٹتے جاتے ہیں
وقت کی دھوپوں میں سائے
بڑھتے، گھٹتے جاتے ہیں
رشتوں کے گنجان درخت
ہر سو کٹتے جاتے ہیں
جاویدؔ اب تو ہر لمحہ
کہرے چھٹتے جاتے ہیں

❁❁

غزل

جانے کیسا ڈر باقی ہے
اندر ہی اندر باقی ہے
رشتے سب کافور ہوئے
ٹوٹا پھوٹا گھر باقی ہے
آتی ہے، آواز برابر
کس بستی میں سر باقی ہے
ہر پہلو زخمی ہے لیکن
بھائی کا خنجر باقی ہے
صبر کیا ہے صبر کریں گے
سینے پر پتھر باقی ہے
لمبے ایک سفر کے بعد
لمبا ایک سفر باقی ہے
ہمسایہ حیراں ہے جاویدؔ
ہمسائے کا گھر باقی ہے

❁❁

Address:

Post Box 833,
Al-Riyadh ; 1142
(K.S.A.)

قیوم واثق

غزل

یہ کیسی رخصتی ہوئی فضائیں سوگوار ہیں
ہوئی ہے سرخ چاندنی ہوائیں سوگوار ہیں
چلے ہی جارہی ہے شب طوالتوں کی گرد میں
سحر کہیں پہ سوگئی دشائیں سوگوار ہیں
لہولہان فاختہ ہے آگری زمین پر
پرندے سرنگوں ہیں سب صدائیں سوگوار ہیں
بہت سی آہوں سسکیوں کا ارتعاش ہر طرف
لباس ماتمی ہوئے ردائیں سوگوار ہیں
اک حزن اور الم کا گیت پھر سے بانسری پہ ہے
اندھیرا چھا رہا ہے اور گھٹائیں سوگوار ہیں
ہے ظاہری سبھاؤ واثقؔ حزیں کا عام سا
یہ بات اب کسی کو کیا بتائیں سوگوار ہیں

(بے نظیر بھٹو کے لیے)

❀❀

Address:
Post Box 5648
JEDDAH - 21432
(K.S.A.)

عقیل گیاوی

غزل

ابھی ہوا نہ ہے دھرتی کی دھول سے رشتہ
ہے اس کرید کا کیسے اُصول سے رشتہ
قدم کو چومے گی خود ہی عروج کی خوشبو
اگر بشر کا ہو عشقِ رسولؐ سے رشتہ
بکھرتے ٹوٹتے لمحوں میں بھی رہا قائم
ادب شناس کا زریں اصول سے رشتہ
ہوا ہو ایسا تو کہیے کہ ان پرندوں کا
رہا ہے کب کسی نخلِ ببول سے رشتہ
شعر وجود کا جاری مگر رہا قائم
گزرتے وقت کا لمحوں کے طول سے رشتہ
عقیلؔ کاش وہ لمحہ حیات میں آئے
ہو جس کا صبر و قناعت کے پھول سے رشتہ

❀❀

Address:
Iqra Academy Wassepur
Dhanbad 826001
Jharkhand (INDIA)

شمی فاروقی

گیت

پربت بھی جھک سکتا ہے
دریا بھی رُک سکتا ہے
لیکن کبھی نہیں رک سکتا ہے
سمے کا بہتا دھارا
جانے یہ جگ سارا

کتنا ہی کوئی زور لگا لے
امبر تک دیوار اٹھا لے
لیکن کبھی نہیں رک سکتا

سمے کا بہتا دھارا
جانے یہ جگ سارا

کل جو تھا وہ آج نہیں ہے
آج ہے جو، وہ کل نہیں ہوگا
ابھی ہے جو پل ابھی ابھی ہے
ابھی کے بعد وہ پل نہیں ہوگا
بیتا ہوا پل آ نہیں سکتا
واپس کبھی دوبارا
جانے یہ جگ سارا

وہی پہنچتے ہیں منزل تک
سمے کے سنگ جو چل سکتے ہیں
اپنے بھاگ کی ریکھا تو کیا
بھاگ۔ وہ جگ کے بدل سکتے ہیں
دور وہ جگ۔ سے کر سکتے ہیں
کلجگ کا اندھیارا
جانے یہ جگ سارا

گیت

پیپل جھولے
برگد جھولے
جھولے بگیا ساری
دور گگن پر پنچھی ناچیں
دھرتی پر پھلواری
امبوا کی ڈالی پر کوکے
کوئلیا متواری
ساون آیا رے، او ساون آیا رے

ہلکی ہلکی پھوار سے نکھرے
گیہوں کی ہریالی
مٹی کی مہکار سے جاگے
کھیتوں میں ہریالی

اللہ سائیں آپ کرے گا
فصلوں کی رکھوالی، ساون آیا رے
گلے میں گھنٹی باندھ کے نکلے
جب بیلوں کی جوڑی
پاؤں سے لگ کر شور مچائے
پائیلیا نگوڑی
کہاں پر توڑی، ساون آیا رے
آموں میں جب رس بھر آیا
فصل لگی جب پکنے
نگر سے لوٹ کے آئے
پردیسی گھر اپنے
پیا ملن کی رت جو آئی
تتلی بن گئے سپنے
ساون آیا رے او ساون آیا رے

گیت

پیشانی پر چاند کا جھومر
ٹھوری بیچ اک تارا
من میں دیے جلائے تیرے
کاجل کا لشکارا

زلفوں میں برسات کا موسم
لہرائے مسکائے
باتوں میں لہجے کی شبنم
کیا کیا پھول کھلائے
آس بڑھاتی خوشبوؤں سے
مہکے جیون سارا
من میں دیے جلائے تیرے
کاجل کا لشکارا

اٹھلا کے تو چلے تو پروا
اک پل کو رک جائے
تنی ہوئی چھاتی کے آگے
پربت بھی جھک جائے
ہنسی بھی ایسی جیسے چھیڑے
دور کوئی اکتارا
من میں دیے جلائے تیرے
کاجل کا لشکارا

پیشانی پر چاند کا جھومر
ٹھوڑی بیچ اک تارا
من میں دیے جلائے تیرے
کاجل کا لشکارا

گیت

کاہے ہنسے چاند میرے جھومر کا
کون آئے گا
نیا نیا شور لاگے گھونگر
کون آئے گا

گھڑی گھڑی کاہے مورا
جوڑا کھل جائے
کاہے موہے راتوں کو
نیند نہیں آئے
کاہے نہیں بھائے گھر نیہر کا
کون آئے گا

میٹھے میٹھے سپنوں کا
جھولا ہے جھولوں
کاہے جیا چاہے سکی
امبر کو چھولوں
کاہے کروں مان
کسی دلبر کا
کون آئے گا

انجانے ساجن کا
دھیان جو آئے
پنگھٹ کو جاؤں
تو چلا نہیں جائے
بوجھ سہا جائے نہیں
گاگر کا
کون آئے گا

کاہے ہنسے چاند مرے جھومر کا
کون آئے گا
نیا نیا شور لاگے گھونگر کا
کون آئے گا

گیت

سپنے او سپنے تیرا
مول ناہی کوئی
بچھڑے دلوں کو
ملاتا ہے تو ہی

پردیسی سیاں سے
لاکھ ہو دوری
ندیا ہو اپنی تو
کیا مجبوری
بند پلک میں
سنگ ہی ترے
آتے ہیں ملنے
سانوریا میرے

برہا کی راتوں کو
راتیں ملن کی
بناتا ہے تو ہی
بچھڑے دلوں کو
ملاتا ہے تو ہی

پاپی جیا چاہے
سوئی رہوں میں
البیلے سپنوں میں
کھوئی رہوں میں
جگ سارا جاگے
جاگے نہ نبنا
یُگ بیت جائے
بتے نہ رہنا
آشا کے پھولوں سے
کانٹوں بھرا جیون
سجاتا ہے تو ہی
بچھڑے دلوں کو
ملاتا ہے تو ہی

گیت

پیہو پیہو جب بولے پپیہا
لاج سے میں مرجاؤں
چھوڑ کے انگنا بابل کا
من چاہے پیا گھر جاؤں

پیہو پیہو کی رٹنا من میں
سویا پیار جگائے
روم روم میں کلیاں چٹکیں
انگ انگ مہکائے
میرا ملن جانے کب ہوگا
کب سانوریا آئے
ایک ہی سپنا دیکھوں، کب تک
کب تک آس لگاؤں
من چاہے پیا گھر جاؤں

میکے میں جی لگے نہ اک پل
سکھیوں میں گھبراؤں
ذرا ذرا سی بات یہ بتا
بہنا سے لڑ جاؤں
آپ ہی اپنے کیے پہ پھر
دیر تلک پچھتاؤں
ہو گئی اتنی بے سدھ کیسے
کس کس کو سمجھاؤں
من چاہے پیا گھر جاؤں
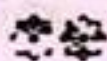
Address:
Flat No. A-12, Bhayani View Aptt.
Block M, North Nazimabad
KARACHI : 74700

اور زبانوں کا ادب

انگریزی : جونا سکاٹ (Jonna Scott)

اُردو : نجم الدین احمد

دریافت

وہ ایسا شخص تھا جو اپنی جہالت کی وجہ سے پاگل نظر آتا تھا۔ درحقیقت وہ اپنے علم کی حدود سے واقف تھا۔ لہٰذا اپنی رائے میں وہ جاہل اور اپنے آپ میں مطمئن رہنے والے پڑوسیوں سے برتر تھا۔ وہ، وہ جاننا چاہتا تھا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اس لیے اس کی جوانی زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی تگ ودو کے لیے وقف ہو گئی تھی۔ یہ کوئی حرص بھری شیطانی تمنا نہیں تھی بلکہ ہر نئی حیرت اسے راتوں کو جگاتی تھی۔ جب اس نے ایک مکمل کیے ہوئے عدسے کو موم بتی کے شعلے کے سامنے رکھا تو اسے ٹھنڈا پسینہ آ گیا اور اس کی ہر قسم کی بھوک ختم ہو گئی۔ اسے کوئی پروا نہیں ہوتی تھی اگر اس کی نظرانداز شدہ بیوی ملاقاتیوں کی تواضع کرنے کے لیے انہیں اپنی خواب گاہ میں لے جاتی اور اس کے پستان ہر کسی کو نظر آ رہے ہوتے۔ اسے صرف نظر نہ آنے والی چیزوں کی پروا تھی۔ وہ جانتا تھا کہ انسانی آنکھ جو کچھ دیکھ سکتی ہے یا دماغ جو کچھ سوچتا ہے، وہ دنیا کے بہت کم حصے کی تعبیر ہے۔ اس کے اکثر ہم عصر مادّے اور روح کے دوہرے نظریات پر مطمئن تھے۔ جب وہ بچہ تھا اس نے تب ہی محسوس کر لیا تھا کہ مادّی دنیا انسان کے ادراک پر ختم نہیں ہوتی۔ جس طرح آسمان غیر مرئی دنیاؤں میں گم ہو جاتا ہے اسی طرح مادّی دنیا بھی اپنے غیر مرئی حصوں میں گم ہو جاتی ہے، لہٰذا اس کا مکمل طور پر تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔

چھوٹی چھوٹی تفاصیل کے ابہام نے اس میں جوش بھر کر اسے پاگل کر دیا تھا بہ الفاظِ دیگر اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ جب وہ چھبیس برس کا جوان تھا تو اس نے خشک اشیاء کی اپنی دکان کے پچھواڑے ایک لیبارٹری بنائی۔ پہلے پہل وہ ایک سادہ کمرہ تھا جہاں وہ تنہائی میں اپنے تجربات کرتا تھا۔ لیکن بعد میں وہ کمرا اس کے کھانے، پینے اور سونے کی جگہ میں تبدیل ہو گیا۔ جس روز اس نے اپنا بستر لیبارٹری میں لا کر ڈالا اس کی بیوی نے اس کے ساتھ جنگ بند کر دی اور اس نے ظاہر کیا کہ وہ بھی شدت سے یہی چاہتی تھی۔ اس محبت اور ہوس کی ماری۔ نے اپنے خاوند

کو سوچنے کا ایک اور موقع نہیں دیا۔ اس نے یہ کام اپنی بڑی بیٹی میری تی پر چھوڑ دیا جو اپنے باپ کے لیے کھانا لے جاتی، جسے وہ شاذ ہی چکھتا تھا۔ بعد کی زندگی میں وہ اسے اس کی ڈاک پہنچانے لگی جسے وہ دیوانگی اور گوشت خور جانور کی سی بے صبری سے ہڑپ کر جاتا تھا۔

وہ ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ڈیلف کا شہری اور پیشے کے اعتبار سے دکان پر کپڑا بیچنے کے ساتھ ساتھ ڈیلف سٹی کونسل کا اہل کار بھی تھا۔ اس کے متعلق یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ کئی سال تک اس نے اپنے کپڑے کے تھانوں کی پیمائش اوران کی فروخت کا کام اپنے شدید جذبے کے باوجود نہایت تندہی سے کیا تھا۔ سوائے اتوار کے وہ ہر روز دکان پر کام کرتا اور ہفتے میں تین شامیں وہ سٹی ہال میں نئے اوزان و پیمائش کا معائنہ کیا کرتا تھا۔ وہ ان کاموں کو اپنے خاندان کی کفالت کے لیے صبر و تحمل کے ساتھ مستقل مزاجی سے کیا کرتا تھا تا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ دیں۔

ہاں تنہا۔ اسے سردیوں کی راتوں کی تنہائی سے محبت تھی۔ اس کی لیبارٹری میں قطار در قطار لگے شمع دانوں کے شعلوں کو باریک مقعر عدسے اس طرح منعکس کرتے تھے کہ وہ ان کی تہہ میں برف میں دفن مچھلی کی طرح نظر آتے تھے۔ وہ خارش، سردی اور حتیٰ کہ اپنی اکڑی ہوئی انگلیوں سے محبت کرتا تھا کیونکہ ان کی تکلیف اسے یاد دلاتی تھی کہ وہ زندہ ہے اور جب تک زندہ ہے وہ اپنے علم کی حد کو کچھ اور بڑھا سکتا تھا، تھوڑا سا اور علم حاصل کر سکتا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا جو وہ دیکھ سکے، ہر رات کچھ نیا اور اس نئے پن میں کچھ حیران کن۔

اس نے عدسہ سازی کا ابتدائی علم ایمسٹرڈم کے چشمہ ساز سے حاصل کیا تھا۔ اس نے اپنے لیے شیشے کیمیا گروں اور عطاروں سے خریدے تھے۔ اس نے تانبے اور سونے کے مستطیل شکنجے خود تیار کیے تھے۔ ڈیلف کے لوگ پیٹھ پیچھے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس نے اپنے کام پر عبور حاصل کیا اور سال ہا سال کے تکلیف دہ تجربات کے بعد اس نے انچ کے آٹھویں حصے سے بھی چھوٹا عدسہ بنانے کا طریقہ دریافت کیا تھا۔ چھوٹا سا ایک عدسہ بنانے اور پالش کرنے میں اسے تین ماہ کا عرصہ لگا تھا۔ جب اس نے ایسے دو عدسے بنا لیے تو اس نے انہیں ایک دوسرے کے اوپر دھات کی تطابق پذیر پلیٹوں کے بیچ رکھا۔ وہ ستائیس برس کا تھا جب اس نے دنیا کی پہلی خوردبین بنانے کا کام ختم کیا۔ اس کے ہاتھ ابھی سے کسی ضعیف العمر کے ہاتھوں کی طرح کانپنے لگے تھے۔ جب وہ عدسوں میں سے دیکھنے کے لیے جھکا تو اس نے خود کو اس گمان کے ساتھ تیار کر لیا تھا کہ اس نے اس سے پہلے ایسی چیز کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔

''یہ ہر لحاظ سے متوازن اور مکمل ہے کہ یہ مجھے چھوٹی چیزیں بھی خوب واضح اور بہت بڑی کر کے دکھاتی ہے۔'' اس نے اپنی ڈائری میں ڈچ زبان میں لکھا جو ماہی گیروں، مزدوروں اور دکانداروں کی زبان تھی۔ وہ لاطینی نہیں بول سکتا تھا۔ لہٰذا وہ نہ کسی کو بتا سکتا تھا اور نہ ہی بتانا چاہتا تھا کہ اس نے ہک کی خوردبین سے زیادہ طاقتور

ایسا آلہ ایجاد کرلیا ہے۔ جس نے غیر مَرئی دنیا کو مَرئی بنا دیا ہے۔ اس کا بیانیہ نہ صرف نا قابلِ یقین بلکہ سوقیانہ بھی تھا۔ یہی بہتر تھا کہ وہ اپنی دریافتیں کسی ذخیرہ اندوز کی سی خوشی۔ لیے اپنے تک محدود رکھتا۔ اس نے خوردبین اپنے استعمال کے لیے بنائی تھی۔ وہ اپنی دریافتوں پر بے انتہا نشہ آور سرخوشی کے ساتھ مسرور تھا کیونکہ یہ ایک راز تھا۔

خود پر انحصار کرتے ہوئے، اپنے مفاد کے لیے اس نے اپنے نتائج اخذ کیے۔ اس نے گوبھی کے چھلکوں، بیل کی آنکھوں، مرغیوں کے جگر، اودبلاؤ کے کھڈوں، ناخن کے ٹکڑوں، مونچھوں کے بالوں، مکھی کے ڈنک، جوں کی ٹانگوں اور اپنے بازو سے اُتری خشک جلد کا معائنہ کیا۔ وہ دن میں اپنی دکان میں مکھیوں کا تعاقب کرتا، کاؤنٹروں اور الماریوں پر چڑھتا۔ حشرات کو اپنے ہاتھوں کی مٹھی میں قید کرکے انہیں شیشے کے جاروں میں بند کرلیتا تاکہ وہ سالم حالت میں دم گھٹنے سے مرجائیں۔ شروع شروع میں اس کے گاہک احمقوں کی سی طنز بھری مسرت سے اسے دیکھتے رہتے۔ پھر ان کا صبر جواب دینے لگا اور جلد ہی انہوں نے اس کی حرکات دیکھنا بند کردیں۔ وہ کپڑا خریدے بغیر ہی دکان سے جانے لگے۔ اگر مَیری نہ ہوتی تو وہ کبھی واپس نہ آتے۔

خوبصورت مَیری کے سرخ وسفید گال ہمیشہ اپنے باپ کے عدسوں کی مانند چمکتے رہتے تھے۔ مَیری نے ڈیلف کی خواتین کو دکان سے دوبارہ خریداری کرنے کے لیے رام کرلیا۔ اس نے فرانسیسی کی اپنی تعلیم ترک کردی تاکہ وہ دکان پر گاہکی کرسکے۔ اس نے اپنے باپ کے کاروبار کو بحران سے اس وجہ سے نہیں نکالا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اسے اپنے باپ پر پیار سے زیادہ غصہ آتا تھا۔ وہ بھی ڈیلف کے دوسرے باشندوں کی طرح اسے دیوانہ سمجھتی تھی۔ لیکن اس میں سترھویں صدی کا احساسِ فرض بہت طاقتور تھا۔ وہ ایک بیٹی تھی۔ اپنی ماں کے برعکس، جس نے خاوند کی دوری پر زوجیت ختم کردی تھی، مَیری ڈیلف کے پاگل عدسہ ساز کی پہلوٹھی کی بیٹی ہی رہی۔ وہ اپنے باپ کی لمبی زندگی (جس کے متعلق بعض اوقات اسے خوف محسوس ہوتا تھا کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوگی) میں اس کی شناخت سے چمٹی رہی جب تک کہ وہ اکیاسی برس کی طویل عمر میں فوت نہ ہوگیا اور وہ خود اس وقت تک ساٹھ سالہ بوڑھی عورت نہ ہوگئی۔ وہ دکان بند کرکے اپنی مختصر وراثت پر پُرسکون، تنہا اور غیر انحصار پذیر زندگی بسر کرسکتی تھی۔

"پکی بھتنی، پاپا کی بہت ہی پیاری۔" وہ یہ بات اس سے اور نہ ہی اس کے بھائیوں اور بہنوں سے کہتا بلکہ ایک مردہ مکھی سے احتیاط سے اس کی چیر پھاڑ کرتے اور اس کے سر کو سوئی کی نوک پر چپکاتے ہوئے کہتا۔ پاپا کی بہت ہی پیاری۔ یہ پدرانہ تشویش کے ساتھ مذاق تھا۔ مَیری اس کے رات کے کھانے کی ٹرے رکھ کر نفرت لیے اپنے پاگل باپ کو اس کے فضول آلات کے ساتھ تنہا چھوڑ کر لوٹ جاتی۔

وہ اپنی غیر مَرئی دنیا میں تنہائی کے مزے لوٹ رہا تھا۔

ہمارے ذوق کی تسکین کے لیے بناوٹ کی کاملیت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مَیری کے باپ کو یقین تھا کہ

کوئی چیز اتنی قابلِ یقین نہیں ہو سکتی جتنا کہ کسی بہت چھوٹے جاندار کا مکمل ہونا۔ آہستہ آہستہ، سالوں بعد اپنے راز کی حفاظت کی خواہش اسے افشا کرنے کی تمنا میں بدل گئی۔ لیکن اگر وہ کسی کو بتانا بھی چاہتا تھا تو اس پر کون یقین کرتا؟ اُسے اِسے ڈچ میں بتانا پڑتا۔ ایک نا قابلِ یقین کہانی اور ڈچ میں! وہ اس پر ہنستے۔ ان کے قہقہے اسے سائرن کے گیت کی طرح ترغیب دلاتے اور وہ بھی ان کے ساتھ مل کر خود پر قہقہے لگانا شروع کر دیتا۔

لیکن وہ اگر انہیں بتا نہیں سکتا تھا تو دکھا تو سکتا تھا۔ اور وہ انہیں اپنے مرنے سے پہلے دکھانا چاہتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کو، صرف ایک آدمی کو یا کسی سائنس دان کو جس پر وہ اعتماد کر سکتا۔ ہاں، وہ ایک قابلِ اعتماد آدمی سے واقف تھا۔ ریگنیئر ڈی گراف، ڈیلف کا واحد شخص جو رائل سوسائٹی کا مکتوباتی رکن تھا۔ وہ اکتالیس برس کا تھا جب اس نے ڈی گراف کو اپنی لیبارٹری کی دعوت دی۔ لیکن وہ خود کو چار سالہ بچے کی مانند محسوس کر رہا تھا۔ جیسے ہی ڈی گراف اس کی خوردبین سے ایک بال کو دیکھنے کے لیے جھکا جو میری کا بال تھا اور جسے اس نے فراخ دلی سے انہیں توڑ کر دیا تھا۔ وہ بھی دیکھتی رہی لیکن اپنے باپ کے فزوں تر اشتیاق کی بجائے ناپسندیدگی کے ساتھ۔ اگرچہ وہ ایک چار سالہ لڑکے کی ماں تھی لیکن وہ اپنے پیر کو پنڈولم کی طرح مسلسل مارتی ڈی گراف کے کام ختم کرنے کی منتظر رہی۔

وہ سُست تھا۔ مَیری کی رائے میں وہ سُست اور اس کے باپ کے خیال میں وہ خوفناک حد تک سُست تھا۔ بالآخر جب ڈی گراف نے اپنی پشت کو سیدھا کر کے اپنا چشمہ اتارا اور اپنی سوجی ہوئی آنکھیں صاف کر کے سر ہلاتے ہوئے بالکل وہی کہا جس کے سننے کی مَیری کے باپ کو توقع تھی۔

"گُڈ گاڈ"

ہاں، خدا اچھا ہے۔ اتنا اچھا کہ مَیری کے باپ کے بعد ڈی گراف نے اپنی آٹھ صفحات کی بے ربط سفارشات سے بھرا ہوا خط لندن کی رائل سوسائٹی کو لکھا جس کا انہوں نے جواب دیا۔ رائل سوسائٹی نے اس زمانے کے بہت سے اوہام کو غلط ثابت کیا تھا۔ جن میں سے مقبول یہ تھا کہ مکڑی ایک سینگ والے جانور کے سینگ سے بنے پوڈر کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ بے شک یہ بہت تیزی سے نکل سکتی ہے اور نکل جاتی ہے۔ لندن میں رائل سوسائٹی نے خود بھی تجربات کیے تھے۔ رائل سوسائٹی کے لوگ حیرت انگیز تھے۔ یہ سائنس دان نہ صرف ڈیلف کے عدسہ ساز میں دلچسپی رکھتے تھے بلکہ وہ اور زیادہ جاننا چاہتے تھے۔

اس نے جو کچھ دیکھا تھا انہیں بتا دیا بلکہ انہیں ڈچ زبان میں ہر چیز، کچھ بھی چھوڑے بغیر بتا دی۔ اب جب وہ اپنی خوردبین میں سے نہیں دیکھ رہا ہوتا تھا تو ان کے سوالات کے جواب دیتا تھا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی محتاط تفصیل سے بیان کرتا تھا۔ اس نے رائل سوسائٹی کی بار بار استدعا کے باوجود اپنی طاقتور خوردبین کو جوڑنے کا طریقہ بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا انتظار کیا جا سکتا تھا۔ دور دراز واقع لندن کے نمایاں شرفاء اب تک اس

کا اعتماد حاصل نہیں کر پائے تھے۔ وہ اس چیز یا اس شخص پر، جسے اس نے دیکھا نہیں ہوتا تھا، اعتبار نہیں کرتا تھا۔

اور پھر ایک سال بعد کی ایک رات جب چودہ روز کی مسلسل بارش کے بعد گھر میں جیلن اس قدر بڑھ گئی تھی کہ صبح تک بستر کی چادر گیلی ہو جاتی تھی، اس نے اپنے آلے کا رخ حوض سے لیے گئے پانی کے ایک قطرے کی جانب موڑ دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے پہلے ایسا کیوں نہیں کیا۔ اپنی بعد کی زندگی میں اسے اس سے زیادہ کسی چیز پر افسوس نہیں ہوا کہ اس نے بہت سے سال مردہ اور بے روح اشیاء کے مطالعے میں ضائع کر دیے کیونکہ اس رات اس نے جو کچھ دیکھا وہ کسی بھی اور شے سے زیادہ حیران کن تھا۔ ہاں، یہ وہ غذا تھی جسے حیرت تلاشتی ہے یعنی زندگی۔

رائل سوسائٹی کو لکھتے وقت اس نے اپنے جذبات قابو میں رکھنے کی کوشش کی:

''میں نے نہایت استعجاب سے دیکھا کہ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جانور تھے جو نہایت حیران کن انداز میں حرکت کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ لٹوؤں کی طرح گھوم رہے تھے تو کچھ، جو بہت ہی زیادہ چھوٹے تھے، کھلبلی کے عالم میں نہایت تیز حرکت کر رہے تھے کہ وہ ناچتی ہوئی بھڑوں یا مکھیوں کے ہجوم کی مانند دکھائی دیتے تھے۔''

لیکن جب اس کی بیٹی میری لیبارٹری میں داخل ہوئی تو جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ اپنی ڈیسک سے اتنی جلدی میں اٹھا کہ وہ اپنی روشنائی کی دوات گرا بیٹھا۔ سیاہی نے اس کے نامکمل خط پر بکھر کر بوٹ جیسی شکل اختیار کر لی۔ سیاہ سیال خوبصورت تھا کہ سیال ہی زندگی ہے۔ اپنی خوردبین کے ذریعے وہ تمام سیال مادوں کا معائنہ کرے گا کنویں کے پانی، نہر کے پانی، چینی ملے پانی، تھوک، پسینے، منی، خون۔ وہ دنیا کے ہر قسم کے سیال کی تحقیق کرے گا۔

وہ اپنی بیٹی کی طرف دوڑا، جوڑے کو شراب کی بوتل کے ساتھ ٹھیک کر کے رکھ رہی تھی کہ اس سے پہلے ہی اس نے اسے پکڑ لیا۔ 'میری!'' اس نے سسکی لے کر اپنا چہرہ اس کی گردن میں گھسا لیا۔

کیا وہ رو رہا تھا؟ میری حیران تھی۔ کیا وہ بالآخر اپنے حواس میں لوٹ آیا تھا اور جان گیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو نظر انداز کر رہا تھا؟ کیا یہ ندامت کی اذیت تھی؟ نہیں، جب اس نے اپنا چہرہ اٹھایا تو میری نے محسوس کیا کہ وہ تو اپنے بچے کھچے حواس بھی کھو بیٹھا تھا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا شخص تھا اور وہ ایک لمبی عورت تھی۔ لہٰذا اپنی بلوغت کے دنوں میں وہ اس سے اونچی ہو گئی تھی۔ اس نے سر جھکا کر اسے دیکھا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ اس کے ہونٹ پیچھے کی طرف یوں کھنچے ہوئے تھے جیسے دھاگے سے کھینچے گئے ہوں۔ میری کو اس وقت یوں لگا جیسے اس کا چہرہ لکڑی اور ویلوٹ کی بنی ایک پتلی کا چہرہ تھا اور ہنسی کی آواز کمرے کے پار سے کسی اور جگہ سے کسی اور آدمی، کسی اجنبی، اندھیرے میں چھپے کسی شیطان کے منہ سے آ رہی تھی، جو اس کے باپ کی جگہ اس کے باپ کے منہ سے ہنس رہا

تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اب بھی اس نے اس عجیب وغریب چہرے میں اپنے باپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تو وہ جیسے ہی بولے گا اسے ہمیشہ کے لیے کھو دے گی۔

"ٹمیری، پیاری ٹمیری، مجھے ایک آنسو دے دو۔"

آہ، کس قدر دردناک آواز تھی۔ وہ کس قدر رحم آمیز شخص تھا۔ وہ سدا کا پاگل تھا۔ اس کے ٹھیک ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسی لیے اسے کبھی پشیمانی نہیں ہوئی۔ اسے اسی وقت اس سے نفرت ہوگئی۔ اسے اس کے ساتھ اپنے کیے پر کبھی نہ تو ندامت ہوئی اور نہ ہی وہ اس سب کے لیے، جو اس نے اس کے لیے کیا، کبھی شکر گزار ہوا۔ وہ اب بھی اپنے باپ کے لیے یا اس آسیب کے لیے، جس نے اس پر قبضہ جما رکھا تھا، احساسِ ذمہ داری رکھتی تھی۔ بغیر احساسِ ذمہ داری کے وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ یہی اس صدی کا المیہ تھا جو اس کا یا اس کے باپ کا قصور نہیں تھا۔ وہ اس احساسِ ذمہ داری کو نہیں اس کی خود غرضی کو موردِ الزام ٹھہراتی تھی۔ ہاں، اس کی خود غرضی جس کی وجہ سے وہ اس پاگل، اکتا دینے والے لکڑی کے کھلونے نما آدمی سے نفرت کرتی تھی۔ اس نے اسے دھکیل کر پرے کرنے کی کوشش کی۔

"ٹمیری!" اس نے اس کا چہرہ پکڑ لیا۔ اپنے ہونٹ اس کے لبوں پر لایا۔ اس نے اس کا بوسہ لیکن یہ بوسہ ویسا نہیں تھا جیسا ایک باپ اپنی بیٹی کا لیتا ہے بلکہ یہ کسی شیطان کی سی بوس وکنار تھی۔ ٹمیری نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ باپ نے اپنی باریک گرم زبان پر اس کا ذائقہ محسوس کیا۔ چند خوفناک لمحوں تک وہ اسے روکنے میں ناکام رہی۔ پھر وہ باپ بیٹی منہ کے بل تیز تیز سانس لیتے ہوئے جدا ہوئے اور ایک دوسرے کو حیرت اور پریشانی سے آئینے میں بنے عکسوں کی طرح دیکھنے لگے۔

ابھی کیا ہوا تھا؟

ٹمیری نے پہلے جانا۔ اس نے حرکت نہیں کی۔ بس اپنی آنکھیں بند کرلیں تاکہ وہ اسے دیکھ نہ سکے۔ اگلے ہی لمحے اس کا باپ بھی سمجھ گیا۔ بے بسی سے ٹمیری کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سمجھ گیا تھا اور شرمندہ تھا۔ لیکن اس کی شرمندگی جھلملا کر ہوا ہوگئی جب اس نے وہ چیز دیکھی جس کی اسے شدید خواہش تھی۔ ایک بڑا، دودھیا آنسو جو اس کی بند پلکوں سے نکل کر اس کے گال پر بہہ رہا تھا۔ "اوہ، فراخ دل ٹمیری!"

اس نے آنسو کو اپنے انگوٹھے کے سرے پر لے کر اسے نمونے کی سلائیڈ پر منتقل کر دیا۔ اس نے سلائیڈ کو میز پر ٹھیک سے رکھا۔ جب وہ عدسوں کو لگا رہا تھا تو ٹمیری لیبارٹری سے نکل گئی۔ اس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر چند کہ اگر وہ اس کا ہوتا تو وہ اپنی شرم وحیا کے سینکڑوں گنا بڑھتے ہوئے اس اظہار کے پہلو سے کبھی صرف نظر نہ کرتا۔ جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ واپس آگئی تو وہ اسے اس غیر معمولی پیکر کو نظریں چرا کر دیکھنے دے گا۔ وہ دوبارہ سلائیڈ کے قریب گیا۔ اس نے غیر شفاف آنسو کو موم بتی کی روشنی میں آگ کا لاثانی رنگ

لیے ہوئے دیکھا۔ وہ اسے کچھ دیر تحسین بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اسے دھاتی پلیٹوں کے بیچ بمشکل اپنے بُری طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رکھنے میں کامیاب ہوا۔ آنسو کا معائنہ کرنے سے پہلے ہی اس نے اپنے ذہن میں وہ خط ترتیب دینا شروع کر دیا جو اس نے رائل اکیڈمی کو لکھنا تھا۔ ''مختلف قسم کے جانوروں کی نا قابلِ یقین تعداد جو نہایت دلکش انداز میں حرکت کرتی ہے۔ وہ سامنے، پیچھے اور دائیں بائیں قلابازیاں کھاتے ہیں۔'' یہ ایسے شخص کے الفاظ تھے جس کے پاس نہ تو دولت تھی اور نہ ہی شہرت لیکن وہ غیر معمولی طور پر کامیاب تھا اور اسے نہایت حیرت انگیز اور نا قابلِ یقین کہانیاں بنانے کی آزادی حاصل تھی۔ اس کی ایجاد کا یہ لافانی اثر تھا کہ اس نے ہمیشہ کے لیے عقیدے کی روح کو بدل دیا۔ ننگی آنکھ سے نظر نہ آنے والی کسی بھی شے پر زیادہ اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہر شے کی اپنی ایک خفی خورد بینی زندگی تھی۔ جن کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا، چیزوں کے بڑا کر دینے کے اس ماہر نے انہیں قابلِ بصارت بنا دیا تھا۔

مختلف قسم کے جانداروں کی نا قابلِ یقین تعداد جو نہایت دلکش انداز میں حرکت کرتی ہے۔ بھوت اور آسیب کا تصور پانی کے ایک قطرے میں زندہ ان ہزاروں چھوٹے چھوٹے جانداروں کے مقابلے میں پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کے تمام دریافت شدہ باریک بیں عجائبات میں آنسو میں بسی یہ کائنات سب سے زیادہ تعجب انگیز تھی۔ عدسے میں اس سے زیادہ حیران کن شے کبھی نہیں دیکھی جاسکی۔ ڈیلف کے عدسہ ساز کے نزدیک، زندگی کی دریافت اور تخلیق میں کوئی فرق نہیں تھا۔

Address:
259-61E Block Z
Model Town,
BAHAWALNAGAR : 62300

افسانہ :

مجھ جیسے کالے کی جانب سے

انگریزی : جان ہوارڈ گریفن

اردو : حیدر جعفری سیّد

۲۴، نومبر

میں ہک کرتا ہوا موبلے اور مونٹگمری کے دلدلی علاقے کے بیچ پہنچا۔ مکمل طور پر روشن اور سہانا دن تھا۔ میں کچھ پیدل چلا ہی ہوں گا کہ کسی بلند قامت اور بہت ہنس مکھ شخص نے اپنا چھوٹا ٹرک روکا اور مجھ سے اندر بیٹھنے کے لیے کہا۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا، مجھے اس کے گھٹنے کے پاس سیٹ سے ٹکی ہوئی شاٹ گن دکھائی دی۔ معاً مجھے یاد آیا کہ الاباما میں کچھ ایسے عناصر ہیں، جن کے لیے "نگر" کو اڑانا شکار کا کھیل ہے۔ اس لیے میں فوراً نیچے اتر آیا۔

"ارے آجاؤ" وہ ہنسا "یہ تو ہرن مارنے کے لیے ہے۔"

میں نے اس کے چمکدار چہرے پر دوبارہ طائرانہ نظر ڈالی وہ شائستہ نظر آیا۔ میں اندر جا کر اس کے پاس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"ادھر گھومتے ہوئے تمہیں کسی اور بھی گاڑی میں لفٹ ملی؟"

"نہیں جناب۔ موبلے سے چلنے کے بعد یہ آپ کی ہی پہلی گاڑی ہے۔"

بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے، ترپن سال کی عمر کا باپ۔ ایک خاندان کا جس میں اضافے نے اُسے دادا اور نانا بنا دیا ہے۔ بات چیت کے لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دراصل ایک جانباز رہبر اور اپنی برادری کا معزز رکن ہے۔ میں سوچنے لگا کہ ایک شریف انسان سے میری ملاقات ہوئی ہے۔

"تم شادی شدہ ہو؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں، جناب"

"کوئی بال بچہ؟"

"جی ہاں، تین"

"تمہاری بیوی خوبصورت ہے؟"

"یس سر"

وہ ایک لمحہ کے لیے رکا پھر اس نے بہت سہولت سے پدرانہ تجسس کے ساتھ پوچھا "کیا اس نے کبھی گورے مرد سے اپنی گود بھروائی ہے؟"

میں نے اپنے کالے ہاتھوں کو گھورا، شادی کے خوبصورت کنگن کو سہلایا اور کچھ فضول سا بدبدایا تا کہ اسے میری خاموشی کا اندازہ ہو جائے لیکن اس نے میرے جذبات کو کچل دیا اور بات چیت زیادہ شیطانی ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس علاقے کے گورے لوگ سیاہ فام چھوکریوں کے لیے کس طرح للچاتے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے امور خانہ داری اور کاروبار میں کئی چھوکریاں لگا رکھی ہیں "اور میں تم سے دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ تنخواہ لینے سے پہلے ان میں سے ہر ایک کو میرا پہلو گرم کرنا پڑا" ایک مختصر وقفہ، تیز گرم سڑک پر ٹائروں کی آواز کے بار خاموشی "اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"کچھ تو انکار کرتی ہوں گی" میں نے بہت سنبھل کر اشارہ کیا۔

"بالکل نہیں۔ اگر انہیں اور ان کے بچوں کو بھوکا نہیں مرنا ہے تو ہماری بات ماننی ہی پڑتی ہے" وہ غرایا۔ "اگر وہ رضامند نہ ہوں تو انہیں اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے"

میں نے کھڑکی کے باہر نظر دوڑائی ہائی وے کے دونوں جانب چیڑ کے اونچے اونچے درخت کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی تارپینی مہک اس آدمی کے خاکی شکاری کپڑوں کی صابنی مہک میں گھل رہی تھی۔

"تم اسے بہت بھیانک سمجھتے ہو، ہے نا؟"

مجھے معلوم تھا کہ کھسیا کر کہنا ہوگا "کیوں نہیں؟ یہ تو فطری ہے" یا کوئی موٹی چٹکی لے کر بچنا پڑے گا تا کہ وہ طیش میں نہ آئے۔

"ہے نا؟" اس نے لطف اندوز ہوتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"شاید، ہاں"

"کیوں، کیا ہے اس میں .... ہر ایک کرتا ہے کیا تمہیں معلوم نہیں؟"

"نو، سر"

"ہوں! سن لو، سب ہی کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں، ہم تم لوگوں پر ایک احسان کر رہے ہیں کہ تمہارے بچوں میں کچھ سفید خون بھی آ جائے۔"

میں اس واہیات خام خیالی سے تمتما اٹھا۔ کسی بھی نیگرو پر ایسا ہی ردِ عمل ہوتا۔ یہ بات ذہن نشین کرنے لائق ہے کہ گورے لوگ نگروں میں جنسی نظریہ اخلاق نہ ہونے کی بات کرتے ہیں یا نسلی آمیزش کے بارے میں شکی ہو کر بولتے ہیں اور اپنی نسلی پاکیزگی پر اتراتے ہیں۔ جنوب میں تو نسلی آمیزش ہر طرف پھیلی ہوئی ہے یہ ایک حقیقت

ہے۔ جنوب کی زندگی میں یہ گوروں کا ہی عطیہ ہے۔ ان کی نسلی آمیزش کی فکر ساری ذاتوں کے لیے نہیں ہے۔

جنوبی زندگی کا یہ روپ اخبارات میں نہیں اچھلتا کیونکہ جیسا کہ میرے ساتھی نے کہا "الاباما کی نگرعورتیں اس معاملے میں بہت سمجھ دار ہیں۔ وہ پولیس کے پاس نہیں جاتیں، کبھی نہیں اور نہ مخالفت کرتی ہیں۔ ذرا سی بھی نہیں۔"

ظاہر ہے کہ اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش کرتیں تو کیا نتیجہ نکلتا۔ جیسا کہ مجھے شک تھا کہ میرے ہاں میں ہاں نہ ملانے سے ڈرائیور ناراض ہو گیا۔ اس نے میری خاموشی کو ٹھیک ہی نامنظوری سمجھا۔

"کہاں کے ہو تم؟"

"ٹیکساس"

"یہاں اتنی دور کیا کرنے آئے ہو؟"

"ویسے ہی گھوم رہا ہوں ملازمت کی تلاش بھی ہے"

"یہاں کسی شرارت کے ارادے سے تو نہیں آئے، کیوں؟"

"اوہ مائی گاڈ نہیں"

"تم نے اگر یہاں نیگروؤں میں کوئی سرسری چھوڑنے کی کوشش کی تو ہم بہت کچھ جانتے ہیں کہ تم جیسے لوگوں سے کس طرح نمٹا جائے۔"

"جی نہیں، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے"

"تمہیں معلوم ہے کہ ہم ایسے شیطانوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں؟"

"نو، سر"

"یا تو انہیں جہازوں پر لاد دیتے ہیں یا انہیں ختم کر دیتے ہیں۔"

اس نے جس غیر متوقع سست لہجے میں یہ بات کہی، میں اس سے بہت کبیدہ خاطر ہوا میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت نیلی آنکھیں پیلی ہو گئی تھیں۔

میں نے بھانپ لیا کہ اس نے طے کر لیا ہے کہ نگر کو "سب کچھ سکھایا جائے" اور کوئی بھی بات اسے پگھلا کر اس میں جذبۂ رحم نہیں پیدا کر سکتی۔ اس خیال کے دیر تک قائم رہنے نے مجھے دہشت زدہ کر دیا۔ مگر اب یہ بات اسے بدتمیزی کرنے کے لیے مل گئی تھی۔ وہ اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس کی آواز خوشی اور سخت دلی سے کھلی ہو گئی تھی۔ ہائی وے کے دونوں جانب کا پھیلاؤ دلدلی جنگل میں گھسا ہوا تھا اور افق تک سنسان اور ویران تھا۔ اس نے گاڑی کی کھڑکیوں کے پار اڑتے ہوئے جھاڑ جھنکار کی جانب گردن گھمائی "ایک نگر کو مار کر اسے دلدل میں پھینک دو۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اس کا کیا ہوا؟"

''یس سر''

میں نے خاموشی اختیار کر لی اور اس شخص کو بہتر روپ میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا میں نے دیکھا کہ وہ اپنے نواسوں، پوتوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ کھلی دعا کی کتاب ہاتھ میں لیے گرجا گھر میں کھڑا ہے، صبح تیار ہونے سے پہلے ایک کپ کافی پی رہا ہے اور پھر شیو کرتا ہے اور اپنی بیوی کے ساتھ کوئی بات کر رہا ہے۔ اتوار کی شام اپنے دوستوں سے ملاقات کر رہا ہے۔ یہ وہ آدمی تھا جسے میں نے ٹرک میں گھستے وقت دیکھا تھا۔ اس کے چہرے مہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ایک مہذب ملنسار آدمی ہے، لیکن یہ جو میں ابھی دیکھ رہا ہوں یہ ہر آدمی کے پیٹ پر سے کھسکتی ہوئی پُراسرار، باریک الیہ لکیر، کوئی ناقص سنگدلی خود غرضی کی قوت سے دوسرے کو اذیت میں مبتلا کرنے کی ہوس ہے۔ یقیناً اس کی بیوی یا قریبی دوستوں نے اسے کبھی بھی اس روپ میں نہیں دیکھا ہوگا۔ یہ پہلو وہ اور کسی کو نہیں بلکہ اپنے شکاروں یا آنا کانی کرنے والوں کو دکھاتا ہوگا۔ بصورت دیگر وہ ایک اچھا شوہر ایک فرض شناس باپ، اور برادری کا ایک معزز رکن۔ میں اپنے تصور میں یہ ہی سب کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنا قبیح پہلو دکھایا اور میں نے اس کے بہترین پہلو کا اندازہ لگایا۔

اپنے آپ کو دوبارہ نارمل کرنے کی کوشش میں اس کا چہرہ کسا ہوا تھا اور تب ہی اس نے اپنی گاڑی میں ہائی وے سے گھما کر جنگل کی جانب جانے والی مٹیالی سڑک پر روک دی۔ میرے خیال میں وہ اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ ہم دونوں ایک چالاک لڑائی میں الجھ گئے ہیں اسے اس سے نجات پانے کے لیے کچھ مطلوب تھا ''میں یہاں سے اندر جاتا ہوں تم شاید ہائی وے پر ہی آگے جانا چاہو گے۔''

میں نے لفٹ دینے کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا اور دروازہ کھولا۔ میرے باہر نکلتے وقت اس نے کہا ''میں تمہیں بتا دوں کہ یہاں کیسا کیا ہے۔ ہم لوگ تم لوگوں کے ساتھ کاروبار کریں گے اور ہر حالت میں تمہاری عورتوں کو رگڑیں گے۔ اس کے دوسری جانب، جہاں تک تم لوگوں کا سوال ہے، تمہارے کھاتے میں ہمارے نام کا صفر ہوگا اور یہ بات جتنی جلد سمجھ لو اتنا ہی تمہارا بھلا ہوگا۔''

''یس سر...........'' میں نے نیچے اتر کر دروازہ بند کیا۔ اس نے مڑتی سڑک پر گاڑی بڑھائی اور پہیوں نے خوبصورت بجری منتشر کی۔ میں اس کے ٹرک کی آواز جنگل میں گم ہونے تک سنتا رہا۔ سڑی دلدل سے بنی ہوئی شام کی بھاری ہوا مہک رہی تھی۔ میں ہائی وے پر چلتا گیا پھر اپنی پرانی جرسی کو بچھا کر بیٹھ گیا دوسری گاڑی کا انتظار کرتا ہوا۔ کوئی نہیں آیا۔ جنگل سے کوئی آواز نہیں آئی اکیلی شام کے رات کے بدلتے ہوئے سناٹے میں بیٹھا اکیلا میں عجیب انداز میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہا تھا۔ دھندلاتا ہوا آسمان اب بھی پیلا تھا جس میں پہلے تارے دکھائی دیے اور زمین کی گرمی اوپر کی جانب اڑنے لگی۔

❁❁

افسانہ :

محبت کا دفن شدہ خوف

سندھی : عنایت لغاری

اُردو : ننگر چنا

عابد ریسرچ اینڈ ٹیکنولوجی ڈپارٹمنٹ میں اچھی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس کے سبب اس کا اسلام آباد میں رہنا ضروری تھا۔ ہر مہینے کے پہلے سنیچر کو بائی ایئر کراچی آتا، جہاں اس کا گھر تھا۔ ڈاکٹر شمائلہ اس کی بیوی تھی اور دو بچے پانچ برس کا ساجد اور تین برس کی زہرا تھے۔ اس نے کئی مرتبہ اپنی بیوی کو اسلام آباد چل کر رہنے کو کہا تھا لیکن وہ جانے کے لیے تیار نہ تھی۔

''شمی جانی! مجھے یہ اسلام آباد پر کراچی کو اہمیت دینے والی بات تو سمجھاؤ؟''

''..............''

''آخر ایسی کیا بات ہے جو تجھے چھوڑنے نہیں دیتی؟''

''عابد جانی! مجھے کراچی سے بے حد محبت ہے۔''

''مجھ سے بھی زیادہ!؟'' عابد حیران تھا۔

وہ دونوں پلنگ پر بیٹھے تھے۔ ایک کھڑکی سمندر کے رُخ پر کھلی تھی، جس کا فقط پردہ لٹک رہا تھا۔ اس کھڑکی سے بہت پیاری اور مست کرنے والی ہوا آ رہی تھی۔ جس وقت عابد نے کہا، ''مجھ سے بھی زیادہ'' تو شمی نے عابد کو بانہوں میں بھینچ لیا اور شاہ لطیف کا ایک شعر سناتے ہوئے کہا،

گر میری رُوح سے ساجنؑ کا خیال نکل جائے
تو پھر گرم لو چلتی رہے اور میں تھر بابیہو بن کر مر جاؤں

(تھر بابیہو ایک پرندہ جو خشک سالی میں بارش کیلئے پکارتا رہتا ہے اور تھوڑی سی گرم ہوا چلنے پر مر جاتا ہے)

''پیاری! لوگ اسلام آباد میں رہائش کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک تم جس کے لیے اسلام آباد کوئی کشش نہیں رکھتا۔'' اس نے شمائلہ کی ایک آنکھ کو **Kiss** کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں سچی بات بتاؤں؟'' شمی نے اس کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ بتاؤ ناں!؟'' عابد نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''اس لیے کہ اسلام آباد سمندر اور محبت کے معاملہ میں بالکل قلاش ہے۔'' شمی نے اس کی گود کا سکھ لوٹتے

ہوئے کہا۔

''اسلام آباد کو سمندر پر ترجیح دینا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن مجھ پر ترجیح دینا............''

''تم آتے ہو تو مجھے سمندر اور اس کی ہوائیں بامعنی لگتی ہیں،'' اس نے عابد کو جملہ پورا کرنے نہیں دیا تھا،

''عابد جانی! تم نہیں ہوتے ناں تو میں ہر رات ''شاہ جو رسالو'' میں سے ''سر سمندری'' پڑھتی ہوں اور اس فکر میں رہتی ہوں کہ تم جو محبت یہاں سے لے کر اسلام آباد جاتے ہو، اس کے ساتھ لوٹ بھی آؤ گے یا نہیں؟''

''کیوں؟ تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں کیا؟''

''تم پر اعتبار تو ہے لیکن اسلام آباد پر اعتبار نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' عابد کے چہرے سے حیرانی عیاں تھی۔

''اسلام آباد بے اعتباریوں کا شہر ہے۔'' شمی کے لہجے سے دکھ جھلک رہا تھا۔ اتنا کہہ کر وہ عابد کے ساتھ لپٹ گئی اور صبح تک عابد یہ بھول چکا تھا کہ اس نے شمی سے اسلام آباد چلنے کا کہا تھا۔

آج مہینے کا پہلا سنیچر گذر چکا تھا۔ وہ میک اپ مکمل کر کے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ عابد ٹیبل لیمپ جلا کر ابھی تک کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ کروٹیں بدل کر تھک چکی تو اٹھ کر عابد کے پاس چلی آئی اور کہا۔

''عابد جانی! کیا مجھ سے بھی کوئی زیادہ خاص چیز ہے؟''

''نہیں، تم سے زیادہ تو نہیں لیکن ہے بہرحال خاص چیز۔'' عابد نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔ شمی نے کتاب اُٹھائی اور نام پڑھا ''The Fire this Time'' اس نے کتاب دوبارہ ٹیبل پر رکھ دی اور پلنگ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''کس کی لکھی ہوئی ہے؟''

''امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل ریمزے کلارک کی۔'' عابد بھی اس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

سمندر کو کھلنے والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور پردہ ہٹا ہوا تھا۔ دور کسی سمندری جہاز کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ چاندنی رات تھی اور سمندر کی لہروں کی ہلکی سی آواز تھی۔ عابد کو پیاس لگی اور وہ پلنگ سے اُٹھنے لگا تو شمی نے پوچھ لیا،

''کیا ہوا؟''

''پیاس لگی ہے۔''

''بیٹھو میں لے آتی ہوں۔'' شمی نے عابد کو بازو سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

''کیوں تم بیٹھو۔ میں خود ہی پی لیتا ہوں۔'' عابد نے اسے تکلیف نہ دینی چاہی۔

''کیوں کیوں سائیں؟ میرے ہاتھوں سے اچھا نہیں لگتا کیا؟'' وہ شمی کے ان الفاظ پر مسکرا کر بیٹھ گیا۔

شمی نے فریج سے منرل واٹر کی بوتل نکالی، گلاس اٹھایا اور اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ گلاس بھر کر اسے

تھما دیا۔

''شمی! اسرائیل کی طرف سے فلسطینی مزاحمت کار لیڈروں کی ٹارگیٹ کلنگ، افغانستان اور عراق پر امریکی حملہ اور قبضہ پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں کی حکومتوں اور عوام کو آپس میں لڑا کر کمزور کرنے کے سازش۔ آخر یہ سامراج چاہتا کیا ہے؟'' اس نے شمی سے گلاس لے لیا۔

''یہ باتیں اسلام آباد جا کر کسی دوست سے Share کرنا۔'' شمی عابد کو متوجہ کرنے کے لیے پلنگ پر سیدھی ہو کر لیٹ گئی اور کہا، ''ایک رات کے لیے آتے ہو اور اسے بھی بے مزہ کرنا چاہتے ہو کیا؟''

شمی کے شکایتی لہجے نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا، کہنے لگا، ''شمی جانی! امریکہ کے پاس چھ ہزار سے زیادہ ایٹم بم ہیں میزائل ہیں اور وہ اتنے طاقتور ہیں کہ جن سے اس دنیا کو اس میں بسنے والے لوگوں کو تین مرتبہ ختم کیا جا سکتا ہے۔''

وہ چونکہ ڈاکٹر تھی اس لیے سمجھ گئی کہ جب کسی آدمی کے دل پر بوجھ ہوتا ہے تو وہ آدمی کسی دوسری کشش کا اثر اس وقت نہیں لیتا، جب تک اس بوجھ سے اپنے آپ کو خالی نہ کرلے۔ یہی سوچ کر اس نے عابد کی طرف دیکھا۔ وہ کہنے لگا، ''جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے ایٹم بم سے امریکہ نے دو لاکھ آدمیوں کو قتل کر دیا۔ ویتنام پر کیمیاوی حملے کیے۔ خلیج کی جنگ میں عراق کو ایران کے خلاف استعمال کرنے کے لیے کیمیاوی اسلحہ دیا۔''

اب شمی اسے غور سے سننے لگی۔ شمی کو موضوع میں دلچسپی لیتے دیکھ کر اس نے بات آگے بڑھائی۔

''امریکہ ۱۹۴۵ء سے ۲۰۰۱ء تک ایٹمی اسلحہ کی تیاری پر چار کھرب ڈالر سے زیادہ رقم خرچ کر چکا ہے۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، شمی نے کہا، ''یہ اتنی رقم ہے کہ جس کے مناسب استعمال سے تمام دنیا سے جہالت، بھوک اور بیماری کو ختم کیا جا سکتا ہے۔''

عابد کو خوشی ہوئی کہ وہ اسے سن رہی ہے اور سمجھ بھی رہی ہے۔ اس نے کہا، ''امریکہ میں اسلحہ تیار کرنے والی فیکٹریاں بڑے اور بھاری کیمیاوی اور بائیولوجیکل ہتھیار بنا رہی ہیں۔ لیکن اور کسی بھی ملک کو ایٹمی پلانٹ سے فائدہ اٹھانا اور ترقی کا سامان تیار کرنا، امریکہ کے لیے ناقابل برداشت ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے بڑا دہشت گرد تو امریکہ ہے۔'' شمی نے کہا۔

''اب امریکہ کو ایک نئے حملے کا ڈر لاحق ہو گیا ہے۔'' عابد نے سرہانے پہ ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''کون سا حملہ؟''

''یہی کہ اسے کمپیوٹر وائرس کے ذریعے، پچاس کھرب ڈالر کا نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔''

شمی کو پہلے تو خوشی ہوئی کہ دشمن کا کچھ نقصان تو ہوگا لیکن جس خدشے نے اس کے دل میں سر اٹھایا اس کو ظاہر کرتے ہوئے کہا، ''اگر اس طرح ہوا تو پھر کسی مسلم ملک پر حملے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ ایران یا شام

میں سے کسی ایک یا دونوں کو ٹارگٹ بنایا جا سکتا ہے۔"

"تمہارے خدشات درست ہیں،" عابد نے کہا، "اور ایک دوسری خبر بھی آئی ہے۔"

"وہ کیا؟" شمی نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"امریکہ اور مغربی اور یورپی ملکوں کے درمیان کمپیوٹر اور موبائل فونز کی جنگ شروع ہو چکی ہے۔ شمی ڈیئر! دنیا میں اب تک ایک ارب پچاس کروڑ موبائل فون کام کر رہے ہیں اور موبائل فون نے کمپیوٹر والے کام بھی سنبھال لیے ہیں۔ بلکہ ان سے آگے بڑھ کر ٹی وی اور ریڈیو کے پروگرام بھی دکھا اور سنا رہے ہیں۔"

"اور اس سے انٹرنیٹ سے بھی رابطے بڑھ جائیں گے۔" شمی نے خیال ظاہر کیا۔

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ عابد سے آدھا گلاس بھرا اور گھونٹ گھونٹ کر کے پی لیا۔ گلاس رکھ کر شمی کے قریب لیٹ گیا اور آواز دی،

"شمی!"

"جی!" شمی نے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے ساتھ چل کر اسلام آباد رہو۔" عابد کے لہجے میں التجا تھی۔

"کیوں؟" شمی حیران تھی۔

"زندگی امریکہ کے کسی میزائل کی خوراک بن جائے، میں چاہتا ہوں کہ میرے دن اور راتیں تمہارے اور بچوں کے ساتھ گزریں۔"

شمی کو خاموش دیکھ کر اس نے بات آگے بڑھائی۔

"امریکہ کے جہاز ساتوں سمندروں میں الرٹ کھڑے ہیں اور ان پر موجود Sabmarines پر ایسے ایٹم بم موجود ہیں جو جاپان پر گرائے گئے بموں سے دس گنا زیادہ طاقتور ہیں۔"

"شمی جانی! مجھے پتہ نہیں کہ یہ خوف کیوں لاحق ہو گیا ہے کہ کچھ Sabmarines یہاں سمندر کے طرف سے آئیں گی اور جب وہ آئیں گی تو پھر تم رہو گی نہ بچے اور نہ یہ گھر۔"

اس کی آواز میں خوف، التجا اور محبت کا تاثر گڈمڈ ہو چکا تھا۔ کہنے لگا،

"شمی جانی! میری بات مان لو اور میرے ساتھ چلو۔ میں وہاں تمہاری موجودگی کے یقین کے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے شمی کی طرف دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسلام آباد چلنے سے انکار نہیں کرے گی۔

شمی نے اسے اپنے بازوؤں میں بھرتے، اسکی طرف کھسکتے ہوئے دل ہی دل میں کہا، "عابد جانی! دوش تمہارا نہیں، اسلام آباد کا ہے۔ خدا جانے کیوں؟ اسلام آباد میں نوکری کرنے والے عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔"

شمی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر عابد کے پیچھے رکھا ہوا ٹیبل لیمپ آف کر دیا۔

❀❀

مطالعے اور جائزے

کتاب : عام آدمی کے خواب (افسانے)	مصنف : رشید امجد
صفحات : ۷۵۰	قیمت : ۶۵۰
ناشر : پورب اکادمی، اسلام آباد	مبصر : نجم الحسن رضوی

رشید امجد کے ۱۳۷ افسانوں کا تازہ مجموعہ جسے ان کی اب تک کی کلیات کہنا چاہیے ''عام آدمی کے خواب'' کے نام سے پورب اکادمی، اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ ایک طریقے سے ان افسانوں میں ہمیں موجود اور ناموجود کے درمیان رشید امجد کے معنوی سفر کا عکس ملتا ہے اور اسلوبیاتی سطح پر ان کے اس تجرباتی میلان کا پتہ چلتا ہے جو ان کی پہچان ہے۔ شاید اسی وجہ سے ناصر عباس نیر نے ان کے افسانوں کو جدید اُردو افسانے کا تاریخی بیانیہ قرار دیا ہے۔

ہر لکھنے والے کی طرح رشید امجد نے فرد اور معاشرے کے خارجی اور باطنی عکس سے اپنے افسانوں کو سجایا ہے مگر اسے دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے قاری کو ایسی خصوصی تھری ڈی عینک، درکار ہوتی ہے جو صرف باطنی کشف سے ہاتھ آتی ہے، ورنہ کردار بے چہرہ اور معاشرہ بے رُوح اور بے شناخت بنا رہتا ہے۔

رشید امجد نے اپنے افسانوں میں معاشرے اور فرد کی بے چہرگی کا مرثیہ لکھا ہے۔ تذبذب، تشکیک، بے یقینی اور زندگی کی بے معنویت ان کے افسانوں میں طرح طرح سے اپنے جلوے دکھاتی ہے۔ اسلوبیاتی سطح پر رشید امجد نے اظہار کے ان گنت امکانات کو آزمایا ہے جس کی بناء پر ان کے یہاں مختلف ادوار میں بیانیے کے مختلف روپ اُبھرے ہیں اور معنوی سطح پر اپنے ہم زاد مرشد کی وساطت سے انکشافِ ذات اور انکشافِ کائنات کی مختلف منزلوں تک ان کی رسائی ہوئی ہے مگر اس کا خوبصورت ترین اظہار ان کے افسانے ''دشتِ امکاں'' میں ہوا ہے جہاں اسلوب و معنی کا ملاپ مکمل اور پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ میرے خیال میں رشید امجد کے پورے تخلیقی سفر کا حاصل یہی کہانی ہے۔ غالباً اس کا احساس خود انہیں بھی ہے اسی لیے اس کتاب کے ابتدائیے میں عام آدمی کے اس خواب کا ذکر کیا ہے جو وراثت میں نئی نسل کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ''ایک عام آدمی کے خواب'' کی سیریز میں دو مزید افسانے تحریر کیے ہیں مگر دشتِ امکاں، میں انہیں اپنے اس خیال کو موثر کہانی میں ڈھالنے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کے بعد مزید کسی کوشش کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

رشید امجد کے افسانے ''دشتِ امکاں'' کو میں ان کا شاہکار سمجھتا ہوں اور اسے پڑھ کے مجھے مرشد کا یہ قول یاد آتا ہے کہ ''سمندر زندہ کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اور مردہ کو باہر پھینک دیتا ہے۔'' اس کہانی میں بھی ہر وہ زندہ چیز موجود ہے جو اس کے لیے ضروری تھی اور جو کچھ موجود نہیں وہ غیر ضروری اور فنی اعتبار سے مردہ۔ کہانی شاید اپنی بہترین صورت میں اس وقت اظہار پاتی ہے جب اس میں خیال اسلوب اور تکنیک اس طرح گھل مل جائیں کہ ان کی الگ الگ پہچان باقی نہ رہے۔ رشید امجد کا پورا تخلیقی سفر فنی تکمیلیت کے اسی سمندر تک پہنچنے کی کوشش سے عبارت ہے۔

اپنی پُر جوش اسلوبیاتی مُبہم جوئی اور ناموجود کی مسلسل جستجو کی بنا پر رشید امجد کے فن کو کبھی کبھی ایک دائرے کے سفر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس دائرے کے باہر بھی ان کے کئی افسانے ایسے ہیں جو نسبتاً الگ ذائقہ رکھتے ہیں اور ان سے الگ سمتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان افسانوں میں عکس دیدہ، چراغ، گلاب، پھول تمنا کا ویران سفر اور بگل والا شامل ہیں۔

کچھ سال پہلے ان کی جو کلیات ''دشت نظر سے آگے'' شائع ہوئی تھی اس میں اس وقت تک شائع ہونے والے ان کے تمام مجموعوں کو یکجا کیا گیا تھا جب کہ نئی کلیات میں بعد کی کتابیں بھی شامل کردی گئی ہیں مگر ان کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کی گئیں۔ اگر ان تمام مجموعوں کے سن اشاعت کے بارے میں اطلاعات شامل کی جاتیں تو قارئین اور خاص طور پر تحقیق کرنے والوں کے لیے اچھا ہوتا جو رشید امجد کے فن کے ارتقائی سفر اور تاریخی ادوار سے بھی آگاہ ہو سکتے تھے۔

کتاب : غالب کا دسترخوان (پیروڈی)	مصنف : انور احمد علوی
صفحات : ۱۴۴	قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : اکادمی بازیافت، اُردو بازار، کراچی	مُبصر : سائرہ غلام نبی

مرزا غالب کے مزاج میں مزاح غالب ضرور تھا۔ اس رعایت سے وہ ''حیوانِ ظریف'' کہلائے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں اس کا برتاؤ اس طرح کیا کہ وہ طرز بس ان سے منسوب ہو کر رہ گیا اور اس کے بعد غالب کے ساتھ مزاح نگاروں نے جو ''سلوک'' کیا، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔

ہمارے سامنے اس وقت معروف مزاح نگار انور احمد علوی نے ''غالب کا دسترخوان'' بچھایا ہے اور اس میں طرح طرح کے ذائقے بہ اندازِ غالب موجود ہیں اس کتاب کے دیباچے میں وہ یوں رقم طراز ہوتے ہیں۔

''استعمال سے پہلے کتاب کو اچھی طرح جھاڑ لیں۔ پڑھ کر طبیعت بوجھل ہونے لگے تو مطالعہ ترک

کردیں۔ اگر حالت زیادہ خراب ہو جائے تو فوراً کسی اچھے کباڑی سے رجوع کریں۔"

مگر میں شرطیہ کہوں گی کہ یہ کتاب جھاڑیں ضرور مگر جھاڑ واڑ کر ورق گردانی میں ہی وقت ضائع مت کریں، بلکہ سطر بہ سطر توجہ سے پڑھنا ضرور شروع کر دیں۔ میرا دعوا ہے کہ نمک، مرچ مسالا، عین میں غالب جیسا ضرور ملے گا۔ ہاں ذائقہ الگ کہ اسے انور احمد علوی کا ہاتھ لگا ہے۔

انور احمد علوی نے اس کتاب میں "خطوطِ غالب" کی پیروڈی میں دورِ حاضر کے حالات، کتابوں کے حوالہ جات، ادیبوں کے معاملات سے لے کر اپنے ذاتی خیالات تک تحریر کیے ہیں۔ وہی ہلکا پھلکا اور شگفتہ انداز کہ جو ان ہی کا حصہ ہے اور سب سے اہم بات کہ لب ولہجہ ولفظیات غالب کا ہی ہے، جسے برتنے کی انہوں نے بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ دیکھیے۔

"صورت تمہاری دیکھ کر مجھ کو کچھ رشک نہ ہوا بھائی! چہرے کی اپنے کسی اچھے صابن سے حفاظت کرو، مرنے کے بعد خلقِ خدا چہرہ ہی تو دیکھتی ہے۔"

شہر کے حالات، بہ اندازِ غالب دیکھیے۔

"اُستاد ذوق کی موٹر قلعے کے باہر سے اُٹھ گئی۔ کنجی ان کے ہاتھ میں رہ گئی۔ تفتہ کی آٹو سائیکل بھرے بازار میں چھن گئی۔ میر مہدی کا گھر دن دیہاڑے لٹ گیا۔ میری میم صاحب کے گہنے سرِ راہ ڈاکو لے اڑا۔ بھائی! یہ شخص مجھ کو اور میرے بھائی یوسف کو بھی لوٹ چکا ہے۔ بندۂ خدا ہمارا "فیملی ڈاکو" بنتا جا رہا ہے۔"

اور بنیادی سہولتوں میں سے ایک سہولت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"صاحب! آج کل یہاں پر پانی کی بہت تنگی ہے۔ سنا ہے بارش کے باعث ٹیلی فون کی لائنوں میں تو آ گیا ہے۔ اب دیکھو نلکوں میں کب تلک پہنچے۔"

خاکہ نگاری کے متعلق وہ بتاتے ہیں۔

"متعلقہ شخصیت کی حد سے زیادہ تعریف نہ ہو، ہاں اگر وہ مطلقہ ہو تو پھر زیادہ تعریف کر دینے میں کچھ مضائقہ نہیں کہ کسی بے سہارا کی دل جوئی عبادت ہے۔ میں نہیں کہتا، تم اپنا قلم روک لو۔ جہاں پر فن نہ ہو، وہاں سوانح لکھ ڈالو۔"

ایک پرچے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"یہاں مریخ سے ایک ادبی ماہنامہ "ظرافت" تیسرے چوتھے مہینے پابندی سے نکلتا ہے۔ ایڈیٹر اس کا اچھا ہے۔ رقم کو دیکھتا ہے، راقم کو نہیں۔"

انور احمد علوی نے اپنی طبعی ظرافت کا مظاہرہ اس کتاب میں اس طرح جا بجا کیا ہے کہ قاری کسی بھی لمحے اس کتاب کو ختم کیے بغیر اس کی دوری نہیں سہہ سکتا۔

کتاب : مجسمہ اور دوسرے افسانے مصنف : امین الدین
صفحات : ۱۶۰ قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : ای ۱۳۵/۲بی، بلاک ۱۰ گلشن اقبال، کراچی مبصر : سائرہ غلام نبی

اُردو کے معروف نقاد دیوندر اسر نے افسانے کے حوالے سے یہ بڑی پیاری بات کہی ہے:

''ہم افسانہ اس لیے نہیں پڑھتے کہ اس میں جواب ہوتے ہیں، ہم اس لیے پڑھتے ہیں کہ اس میں خواب ہوتے ہیں۔''

مگر یہ عصری جبر ہے کہ اُداس وملول کر دینے والے ہر واقعہ سے ہماری زمانی قربت جیسے جیسے بڑھتی جارہی ہے۔ حیرت کدۂ دنیا کے سارے ہی اسرار آشکار ہوتے جارہے ہیں بلکہ اب تو ہر طلسم ٹوٹ کر بکھر چکا ہے۔ پھیلی ہوئی کائنات کی مکانیت سمٹ کر ہماری آنکھ کے گوشوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ فکر وشعور کے نئے نئے سوتے پھوٹ رہے ہیں۔ استحصالی رویے، بے اعتباری، بے بسی، بے معنویت، بے چینی واضطراب سے غیر یقینی بڑھ چکی ہے۔ جان لی جانے والی حقیقتوں کی چبھن سے عافیت یکسر مفقود ہو گئی ہے۔ کھلی کھلی سچائیاں قدم قدم ہمارے ساتھ ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ میں یہ سمجھ سکوں کہ کوئی بھی منظر صرف میری آنکھ کا مقدر ہے، یا جو میں نے دیکھا یہ صرف میرا اثاثہ ہے۔ سو آج کے فکشن رائٹر کے لیے تخلیقی عمل بہت زیادہ کا متقاضی ہو چکا ہے۔

محمد امین الدین جو کہ پانچ افسانوں کے مجموعوں اور ایک ناول کے تخلیق کار ہیں، ان کا چھٹا اور تازہ مجموعہ ''مجسمہ اور دوسرے افسانے'' حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں ''مجسمہ'' کے علاوہ چودہ افسانے اور ہیں۔ گویا کل پندرہ افسانوں میں مصنف نے انسانی تجربات کی عکاسی کئی زاویوں سے کرتے ہوئے مختلف عنوانات سے انہیں شناخت دی ہے۔ راست بیانیہ میں تحریر ان افسانوں میں خلق کی ہوئی دنیا دیکھی بھالی اور مانوس ہے۔ وہ ہمارے ہی شہر کے گلی، محلوں، گزرگاہوں، اور چوراہوں سے واقعات کے ڈھیر میں سے کچھ کہانیاں چن لیتے ہیں۔

محمد امین الدین اپنے افسانوں کی پیشکش میں، بڑے بڑے آدرشوں کی بجائے چھوٹے چھوٹے رموز پر ارتکاز کرتے ہیں، انسانی روابط اور ان کے باہمی ٹوٹتے ہوئے تعلقات پر بطورِ خاص توجہ کرتے ہیں۔ کفایت لفظی میں، فن کارانہ حساسیت سطر بہ سطر اُبھرنے لگتی ہے۔ کتنے ہی سچ، کتنے ہی جھوٹ، کتنی ہی تنہائی اور کتنی ہی اُداسی جھلکنے لگتی ہے۔ نئے سماج کی نئی سماجیات جس نے فرد کو فرد سے اجنبی کر دیا ہے اور طاقتی ناطاقتی کی جنگ میں ہمیں زبردستی دھکیل دیا ہے۔ اور یہ سلسلہ دراز تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس مرحلے پر محمد امین الدین کوئی بھی احتجاجی رویہ کوئی بھی دوٹوک بات یا کوئی نوکیلا انداز اختیار کرنے کی بجائے سچائی وسادگی سے صورتِ حال کو سامنے رکھ دیتے

ہیں اور یہی صاف رواں اسلوب ان کے افسانے کی ترسیل کو قبول عام کرتا ہے۔

زیرِ تبصرہ اس مجموعے کے ان افسانوں کے اکثر کردار دکھوں اور مصائب کی دنیا میں سانس لیتے ہیں۔ وہ نڈھال، غم زدہ اور دکھی ہونے کے ساتھ ساتھ چالاک، شاطر اور مجرمانہ ذہن بھی رکھتے ہیں۔ وہ اپنے دُکھوں کا حل اپنے ہی جیسے فرد کو بے بس کر کے نکالنا چاہتے ہیں۔ افسانہ ''گویم مشکل'' میں قربان علی کا کردار اس کی مثال ہے۔ اس کہانی کو مصنف نے کئی ٹکڑوں میں بنا ہے۔ آٹھ اکتوبر کے قیامت خیز زلزلے نے یقین و اعتماد کی سطحوں کو دولخت کر دیا ہے۔ محمد امین الدین نے انسان کی وحشیانہ سرشت کو موضوع بناتے ہوئے ایک نہیں بلکہ کئی معاملات کو ابھارا ہے۔ اس افسانے میں پوشیدہ اور آڑے ترچھے کئی مناظر میں زندگی کے کئی تجربے لپٹے ہوئے ہیں۔

افسانہ ''آوازیں'' حسیاتی سطح پر اپنی پہچان کرواتا ہے۔ کہانی کا راوی بصارت کا آشوب جھیلتا ہے۔ وہ اپنی سماعت سے سماجی و ثقافتی زندگی کا لمس محسوس کرتا ہے۔ مصنف نے چھوٹے چھوٹے فقروں سے اس پیچیدہ تر صورتِ حال کی فضا سازی کی ہے جو ہمیں اب درپیش ہے۔ جس سے سماعت کا آشوب جنم لے رہا ہے۔

ان کے دو افسانوں ''الٹی کھوپڑی کا آدمی'' اور ''بس اتنا ضروری ہے'' میں مذہب کا لبادہ اوڑھ لینے والے کرداروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ اوّل الذکر افسانے میں مصنف کے فکری زاویوں سے سوچ کا تحرک پیدا ہوتا ہے کہ مذہب محض بے عقلی سے تقلید کرنے کا نام ہے مکالمے کے وسیلے سے افسانہ تیز رفتاری سے آگے بڑھتا ہے اور معاملات کے تضادات کو اُبھارتا ہے۔

یہ تو تھے دوسرے افسانے ''مجسمہ'' اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ اس افسانے کو مصنف نے اوّلیت دی ہے اور خصوصیت بھی، مجھے یہ افسانہ اس مجموعے کے دیگر افسانوں سے مختلف ذائقے کا محسوس ہوا۔ اس افسانے کی استعاراتی فضا کی تشکیل میں یقین اور بے یقینی، رمزیت، اشاریت اور علامت سے اُجاگر ہو رہی ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار کو شناخت کا مسئلہ درپیش ہے۔ وہ سنگ تراش ہے۔ اور زندگی کے اس موڑ پر جب اس کے ادھورے پن کی تکمیلیت کی خبر ملتی ہے تو اس کے ذہن نے اس کے اندر اضطراب اُگا دیا ہے۔ اور یہ اضطراب و بے چینی اسے پتھر سے ایک صورت تراشنے پر مجبور کر رہی ہے۔ جنس کی آزادہ روی ہمارے ماحول میں قدرے کم کم مغربی ماحول میں بہت بہت ہے۔ اس موضوع کے برتاؤ میں خوش سلیقگی نظر آتی ہے۔

محمد امین نے نازک موضوع کو لفظوں کا پیراہن اس طرح دیا ہے کہ عریاں بدنمائی چھپ گئی ہے۔

پندرہ کہانیوں پر مشتمل یہ مجموعہ مصنف کے تخلیقی سرمائے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ انہوں نے اعتماد کے ساتھ اپنے افسانوں کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا اگلا قدم کہاں اور کب ہوگا امکانات کی دنیا روشن ہے۔!

کتاب : یاد کی بارشیں (شاعری)	شاعرہ : فاطمہ حسن
صفحات : ۲۹۶	قیمت : ۳۵۰روپے
ناشر : روش پبلی کیشنز، اُردو بازار، لاہور	مُبصر : سائرہ غلام نبی

فاطمہ حسن کے شعری سفر میں تین پڑاؤ آئے ہیں۔ جنہیں انہوں نے ''بہتے ہوئے پھول'' دستک سے در کا فاصلہ، ''یادیں بھی خواب ہوئیں'' کے نام دیے اور پھر اسی سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی خوش سلیقگی کا اظہار یوں کیا کہ ان تینوں مجموعوں کو ''یاد کی بارشیں'' کا عنوان دے کر یکجا کر لیا۔ حال ہی میں شائع ہونے والی اس کلیات کا ورق ورق الٹتے ہوئے اس شاعرہ کو دائرۂ خیال میں لا رہی ہوں، جو فاطمہ حسن کے نام سے معروف ہے۔

اس پر ہنگام زندگی میں، میں نے جب جب انہیں دیکھا بے پناہ مصروفیات میں اُلجھی، پیچیدہ مسائل کو سلجھاتی ہوئی دفتر، گھر، محفل، مشاعروں میں الگ الگ حیثیتوں میں مگن!

اور میں انہیں دیکھ کر یہی سوچتی ہوں کہ ان کی اس شاعرہ سے ملاقات کب کب ہوتی ہے۔ جو فطرت کی لطافتوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ جو احساسات کو مصرعوں میں سمو دیتی ہے۔ محبتوں کے خواب میں گم ہو جاتی ہے۔ اور یہی لطافت خیال کی منہ بند کلیاں، پھول بن کے چٹکنے لگتی ہیں تو ان پھولوں کی خوشبو دھیرے دھیرے فاطمہ کے وجود کو اپنی لپیٹ میں اس طرح لے لیتی ہے کہ یہی بنیادی شناخت بن جاتی ہے اور ''یاد کی بارشیں''، میں بھی یہی شناخت مستحکم نظر آتی ہے۔

فاطمہ کی غزلوں، نظموں کو تسلسل سے پڑھتے ہوئے سب سے پہلے یہ احساس جاگتا ہے کہ ان کی طبیعت میں فطرت سے گہری مناسبت ہے۔ وہ شہر کی کثیف اور دھندلی فضاؤں میں اپنے آپ کو گم کر لیتی ہیں اور ایسی دنیاؤں میں نکل جاتی ہیں۔ جہاں شفاف و نیلا آسمان بے کنار ہے تو زمین پر دور تک سبز گھاس اس پر بچھی ہوئی ہے۔ معطر ہوائیں گنگناہٹ بکھیر رہی ہیں اور بوندوں بھرے بادل کھلکھلا رہے ہیں۔ پھولوں، پرندوں اور خوشبوؤں کے رنگ ہی رنگ ہیں، مہک ہی مہک ہے۔

فاطمہ حسن کی شاعری میں محبتوں کے نرم اور کومل احساسات، ہجر و وصال سود و زیاں سے ہٹ کر، دُکھ اور سرشاریوں سے ماورا، اپنی الگ ہی کیفیات میں جھلکتے ہیں۔ محبت، جذبوں میں ڈھل کر، نکھر کر، سنور کر، اشعار میں یوں در آتے ہیں کہ نسوانی جمالیات کا بھرپور اظہار بن جاتے ہیں۔ وہ فطری نسوانی انداز میں مدھر لہجے میں بات کہتی ہیں۔ لیکن اپنی صنف (عورت) پر ہوتے ہوئے ظلم کو برداشت نہیں کر سکتی ہیں۔ یہ بڑا وصف ہے۔

کتاب : لفظاب	مصنف : قوس صدیقی
صفحات : ۱۵۱	قیمت : ۲۰۰روپے
ناشر : دانش مرکز، پھلواری شریف، پٹنہ	مُبصر : محمود واجد

بلندی بلکہ کچھ بلندی پر کھڑے ہوکر تقریر تو کی جاسکتی ہے شعر نہیں کہا جاسکتا۔ پھر سند لینے والی خواہش بھی بعض اوقات بڑی جان لیوا ہوتی ہے بلکہ ہوئی ہے سو ہمیں ''لفظاب'' کے شاعر سے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے کہ آپ نے غزلوں کی پوری کتاب شائع فرمائی ہے تو تغزل کہاں گم ہوااور کیوں نہ ہم اسے غزل نما کہہ کر صبر کرلیں کہ شاید اب وہ دور نہیں رہا کہ غزل کی بنیادی تعریف کے آس پاس رہ کر معنی تلاش کیے جائیں اور ڈاکٹر وہاب اپنی رائے ریکارڈ کراتے وقت بے بس سے نظر آئیں۔ یہ بات نہ جانے کیوں میں نے ''لفظاب'' کے اوراق الٹتے ہوئے سوچے۔ کچھ کہنے سے پہلے یہ شعر سامنے آگیا۔

ایک تنہا درد جو گھلتا رہا لفظاب میں	ورنہ سب کچھ حلقۂ باب اثرِیابی میں تھا

چلیے جملۂ معترضہ سے آگے بڑھتے ہیں کہ وقت کم ہے اور باتیں زیادہ۔ ورق الٹتے ہوئے صفحہ ۳۲ غزلیں شروع ہوکر صفحہ ۱۵۱ تک پھر کوئی سو سے اوپر صفحات غزلوں کے رہ جاتے ہیں مگر غزلیں کوئی ۸۰ صفحوں پر ۴۰ غزلیں اور ۴۰ صفحوں پر ۴۰ غزلیں قصہ ختم۔ ایسا اہتمام کیا گیا ہے کہ کوئی غزل ۵ یا ۷ اشعار سے زیادہ کی نہ ہو۔ کاش یہ اہتمام شعری محاسن پر بھی صرف ہوتا۔

حمد و نعت اس اہتمام سے مستثنیٰ ہیں۔

لیجیے اب شعر بھی سن لیجیے۔

صبح کا دامن شفق کے نام کرجاتی ہے وہ	پھول کی پتی پہ جب ہوتی ہے شبنم بے پناہ
بہت حسیں نہیں ہوتا بیان رنگ آمیز	جو بات جتنی حقیقت ہو برملا لکھنا
بے عقیدہ زندگی میں کچھ نہیں ربط لطیف	اب پجارن پھول کی تھالی کہاں لے جائے گی

جی ہاں اچھے اشعار بھی ہیں مگر ان کا رخ بھی ملاحظہ ہو۔

یہ جو ہیں معصوم چہروں پہ سوالوں کے نشاں	پڑھ انہیں، ہیں آنے والے انقلابوں کے خطوط
سناٹوں کے خونی چہرے تنہائی کا ننگا پن	راتوں کی زہریلی ہوائیں خوابوں کے دیوار و در
میری ہر آواز میرے عہد کا اقرار ہے	ورنہ زیرِ بام بانگ بے نوا دیتا ہے کون

ممکن ہے کہ لکھ جائے نہ تعبیر زمیں پر — اس ڈر سے مری آنکھ میں سپنا نہیں آتا

آنکھوں ہی آنکھوں میں ہوتا رہا ہے منتقل — صدیوں سے اک مکان جو خوابوں میں قید ہے

تہہ نشیں بے مائیگی میں زور طغیانی نہ تھا — ڈوب کر دیکھا تو گہری جھیل میں پانی نہ تھا

ہماری سوچ اپنی ہے سبھوں سے مختلف اے قوسؔ — بلا سے ننھی منھی ہے یہ دنیا ساتھ رکھتے ہیں

ساتھ رکھنے کے اصرار کو کسی بھی طرح دنیاداری نہیں کہا جاسکتا یہ ایک وصف ہے اور اس کی قدر ہونی چاہیے لیکن کیا مختلف ہونا ہی غزل کی ضرورتوں کو پورا کردیتا ہے۔ یہ سوال کوئی بھی کرسکتا ہے۔ یقین تو نہیں لیکن غالباً قوس صاحب مختلف ہونے کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا غزل سے تغزل کو نکال کر زیادہ دور چلا جاسکتا ہے۔ اپنی بات کی ترسیل کے لیے اور بھی ذرائع ہیں انہیں کیوں نہ آزمایا جائے آپ ہی کا شعر ہے۔

حالات ایسے آئے کہ کچھ سوچنا پڑا — پھر پائے احتیاط میں یہ آبلہ پڑا

کیا آپ مختلف ہونے کے آزار سے بچ نہیں سکتے تھے!، یہ سوال ہے!

کتاب : سعادت حسن منٹو: ایک نئی تعبیر — مصنف : فتح محمد ملک

صفحات : ۱۷۶ — قیمت : ۱۵۰ روپے

ناشر : سنگِ میل پبلی کیشنز، اُردو بازار، لاہور — مُبصر : محمود واجد

۱۹۵۳ء میں جب میں نے پہلا تنقیدی مضمون لکھا ''منٹو کے افسانوں میں نفسیاتی پہلو'' تو اس وقت میں خود یونیورسٹی کا طالب علم تھا مگر ادب کا نہیں تجارت کا۔ مجھے انعام بھی ملا مقالے کے لیے اور کئی ادبی مقالوں کے لیے پذیرائی بھی۔ کوئی ایک سال کے بعد جنوری ۱۹۵۵ء میں منٹو کا لاہور میں انتقال ہوگیا اور ہندوپاک کے کئی رسائل نے منٹو نمبر نکالے تو ''پگڈنڈی'' امرتسر میں میرا مضمون سرِ فہرست شائع ہوا، اس وقت میں خود ہندوستانی تھا۔ اب ۷۰+ کی عمر میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو نصف ہندوستان اور نصف پاکستان میں گزرے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ منٹو کی جو قدر و منزلت اور کام ہندوستان میں ہو وہ پاکستان میں شائع ہونے والی کتب سے ممکن نہ ہو۔

ابھی چند ماہ قبل جناب فتح محمد ملک نے ''سعادت حسن منٹو: ایک نئی تعبیر'' بھیجی تو خیال آیا کہ ذرا فاصلے سے چیزوں کو دیکھا جائے تو اس کا صحیح تعین قدر ممکن ہوسکتا ہے۔ ابھی کوئی تین سال قبل میں علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں اپنا پیپر فکشن پر پڑھنے گیا تھا تو مشہور ناقد ڈاکٹر وہاب اشرفی کے گھر سے (جہاں میں چند دن ٹھہرا تھا) ان کے ایک عزیز شاگرد پروفیسر ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کئی ضخیم جلدوں میں منٹو پر ایک اہم کام کیا تھا

دیکھ کر جی خوش ہوا۔ دہلی کے ایک معروف پبلشرز نے شائع کیا تھا۔

پروفیسر فتح محمد ملک کا کام دراصل کھوئی ہوئی کڑیوں کو تلاش کیا جاسکتا ہے جسے انہوں نے خود نئی تعبیر سے کیا ہے اور اپنے آپ کو قدود پناہ گاہوں میں لے آئے ہیں۔ پوری کتاب بننا ممکن نہ تھا تو سات مضامین کے ساتھ دس ضمیمہ جات شامل کیے گئے ہیں جو سب کے سب اپنی جگہ اہم ہیں اور لکھنے والوں میں خود منٹو کے علاوہ حسن عسکری ظہیر کاشمیری اور فتح محمد ملک کی تحریریں موجود ہیں۔

فہرست کا پہلو مضمون ''منٹو کی پاکستانیت'' ہی اپنی بعض خوبیوں کے باعث دامنِ دل کھینچتا ہے اور ساتھ ہی منٹو کی زندگی کے چند گوشوں کی گرہ کشائی بھی۔ مثلاً یہ کہ باری علیگ کے بارے میں منٹو لکھتے ہیں: ''مجھے تحریر و تصنیف کے راستے پر ڈالنے والے وہی تھے۔''

اپنے کیریر کے **Formative Stage** میں احسان مندی کا احساس منٹو کی شخصیت کا واضح نشان ہے۔ جناب فتح محمد ملک تجزیہ اور اندر جا کر نیا رُخ پاکستانیت کی روح کو چھولیتا ہے اگر ایسا کہنا مناسب ہو تو پھر کروڑوں مسلمانوں کا وہاں رہ جانا بلکہ چھوٹ جانا پاکستان سے کس محبت کا اظہار ہے سمجھ میں آنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ زمینی حقیقت ایک بڑی ظالم شے ہے۔ جس کا عملی مشاہدہ مجھ جیسے لوگ کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کے ٹوٹنے اور پاکستان کے ٹوٹنے کے عینی شاہد رہے ہیں۔ منٹو کی پاکستانیت ثابت کی جاسکتی ہے۔ جس پر ملک صاحب کا اصرار ہے لیکن اس سے منٹو کی انسانیت کہاں ثابت ہوتی ہے اور خود منٹو اس کا تصور نہیں کر سکے کہ جب طوفان تھمے گا تو گرد و غبار چھٹ جائیں گے اور نئی بارش سے فضا مشک بار ہوگی اور پھر زندگی اپنی نہج پر رواں ہو جائے گی۔

ہجرت کی پوری تاریخ کو اگر ہم **Rationalize** کرنے بیٹھ گئے تو شاید ہم بہت تلخ حقائق سے آشنا ہو سکیں۔ زندگی کا کاروان تو چلتا رہے گا۔ اگر آپ منٹو کو خاص پاکستانی کہنے پر مصر ہیں تو اور کچھ نہیں تو کم از کم منٹو کو آپ محدود کر رہے ہوں گے۔ بڑا انسان (اور فنکار بھی) کسی خطہ زمین سے نہیں پہچانا جاتا (یہ بایوڈاٹا تیار کرنے کے عمل کی باتیں ہیں) دوسرے معنوں میں ہم منٹو کو مشروط کر رہے ہوں گے اگر ہم انہیں کسی ایک ملک کے کھاتے میں ڈال دیں۔ دراصل انسانیت ایک بڑا دائرہ ہے، جس میں اعلیٰ ادب کو اس کے تمام لوازمات کے ساتھ قبول کرنا ہوتا ہے۔ جس میں زمینی حقیقت بھی شامل ہے۔ منٹو تو خیر سے اس متمول حصے میں پیدا ہوئے تھے جسے پاکستان کو حربی و ضربی برتری حاصل ہوئی تھی مگر دوسرے مسلمانوں کا کیا ہوتا یا ہوا جنہیں زمینی رشتے کا یہ سہارا بھی نہ تھا۔

بہر حال جناب فتح محمد ملک منٹو کو پاکستانی منٹو بنا ہوا بہت دن تک نہیں دیکھ سکے مگر پاکستانی ثابت کرنا ان کے دائرۂ اختیار میں تھا سو انہوں نے کر لیا۔ پتہ نہیں یہ نیکی ان کے کس کھاتے میں لکھی جائے گی اور اس کے مضمرات و ممکنات کی جہتیں کن حدوں کو چھو رہی ہوں گی۔ پوری کتاب دلچسپ ہے اور ایک سے زائد بار پڑھی جانے کی مستحق۔ یہ تاریخ کی درستگی کا حصہ بھی بن سکتی ہے اگر اسے اسی طور پر دیکھا جاسکے اور تخلیق کے تعین قدر میں

معاون ہو سکتی ہے اگر اسے اہداف تک لے جایا جا سکے۔ ضمیمہ جات کی شمولیت سے کتاب کو افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

اسے پڑھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ منٹو لٹریچر میں یہ اضافہ کتنی دور اور دیر تک آپ کو مطمئن رکھ سکے گا۔ ہم بہر حال ان کی پُر خلوص کاوش کے قدر دان ہیں۔ عرض صرف اتنا کرنا ہے کہ منٹو صرف ہمارا نہیں عالمی ادب کا بے حد اہم کارکن اور بڑا فنکار ہے۔ اس کے مقام کا از سرِ نو تعین ہونا چاہیے اور عالمی ادب میں اس کی مناسب Placement کا اہتمام کرنا چاہیے۔ آیئے سوچیں!

کتاب : آفاق کی طرف (شاعری)	مصنف : خلیل مامون
صفحات : ۴۱۶	قیمت : ۳۶۰ روپے
ناشر : افلاک پبلی کیشنز گلبرگ 585104	مُبصّر : محمود واجد

معروف قلم کار محمود ہاشمی نے اس کتاب کو ''اپنے عہد کی تاریکیوں میں ذات کی جستجو کا استعارہ'' کہا ہے اور صلاح الدین پرویز نے اسے ''ماورائیت کی شاعری'' سے موسوم کیا ہے۔ اس کا جوہر بہر حال زمینی سطح سے بلند ہو کر زندگی کو محسوس کرنا ہے۔ کتاب کا نام بھی اس کی تفہیم میں ہماری مدد کرتا ہے۔ شمیم حنفی نے ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے: ''خلیل مامون کی شاعری ایک واضح شخصی جہت رکھتی ہے۔ اپنے آپ کو اپنے معاصرین سے الگ کسی اور سطح پر دیکھنا اور دکھانا چاہتی ہے۔'' خود مصنف/شاعر کا خیال ہے: ''یہ نظمیں میری اپنی نظمیں ہیں اور ان میں آپ کو تجربات اور اظہار و معنی کی ایک نئی کائنات سانس لیتی دکھائی دے گی۔'' اور بھی آرا ہیں۔ میں اضافہ نہیں کر سکتا لیکن اتنا کہوں گا کہ اس میں ایک خاص کلچر اور زمینی سطح کا احساس نمایاں طور پر اپنا ظہور پاتا ہے کھلی کھلی پیش کش ان کے کھلے ذہن کا استعارہ بھی ہے۔

عجیب اتفاق کہ جس وقت میں یہ کچھ لکھ رہا ہوں یہاں پاکستان میں ربیع الاوّل کا جشن منایا جا رہا ہے۔ ہر طرف نعت کی محفلیں سجی ہیں اور یہ کتاب بھی نعت سے شروع ہوتی ہے لیکن بالکل مختلف آہنگ دے موسم ترا کوئی نہیں ہر وقت بہاراں ہر دم ہے زمانے میں ترے لمس کی نکہت مامون نہیں مردہ کسی خواب عدم میں ہے سر پہ مرے شہد کونین کو شفقت اور سارے اشعار بھی محبت سے سرشار ہیں ایک اور بھی سنتے چلیں۔

لمحات کا قیدی ہوں تجھ دیکھ نہ پاؤں تو تا بہ ابد پھیلا ہو دستِ محبت عقیدت کا یہ انداز پاکستان میں کم کم ہی دستیاب ہے اس لیے زیادہ قابل قدر ہے۔

زمینیت کے احساس کے ساتھ پُر اسراریت خلیل مامون کے ''اندر اور باہر کا منظر'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ آگے بڑھے کوئی تین سو صفحوں تک نظموں کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور ۱۲ غزلیں اختتام کلام کے طور پر شامل ہیں۔ ان دو اصناف میں ان کا رنگ سخن مختلف ہونے کی گواہی دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ چند اشعار بے اختیار زبان پہ آجاتے ہیں۔

ملے بیاض جو تجھ سی کتاب ہی لکھ دوں — لہو سے دل کے شب غم میں خواب ہی لکھ دوں

میں جلتی دھوپ کو سایہ سحاب کا مانوں — ببول ہو بھی تو اس کو گلاب ہی لکھ دوں

مصروف غم ہیں کون و مکاں جاگتے رہو — خوابوں سے اٹھ رہا ہے دھواں جاگتے رہو

ہیں شام کے نصیب تارے نہ نہ آسماں — رک سا گیا ہے قلب جہاں جاگتے رہو

خلیل مامون بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور وہاں اپنا جوہر خوب دکھاتے ہیں ورنہ کوئی تین سو صفحات تک ہمیں کس طرح لے جاتے اور ایسے کہ کہیں رکنے کی مہلت نہیں دیتے ''اندر اور باہر کا منظر'' سے شروع کیجیے تو ''ہمیں است'' تک کوئی سو سے اوپر نظمیں تواتر سے بالکل مختلف موضوعات پر لکھنا اور خوبصورتی سے پیش کرنا شاعر کی شخصیت کے ایک اہم گوشے مرتب کرتی شخصیت کا اظہار بنتی ہیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ شاعر کی شخصیت کسی فنی پیش رفت میں اپنے آپ کو دُہرا رہے ہیں۔ آپ پڑھتے چلے جائیں گے یہاں تک تین سو صفحات سے زیادہ کی قرات آپ کو بھرپور تاثر کے مقام پر چھوڑ جائے گی۔ ان باتوں کا قطعی یہ مفہوم نہیں کہ بس رواروی میں پوری کتاب کی ورق گردانی کے تاثر کے مرحلے سے ضرور گزر جائے۔ ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے اور لطف حاصل کیجیے یوں ایک بھرپور شعری حسن اور تکمیلیت کا احساس نہ ہو تو کتاب رکھ دیجیے اور وقفہ دے کر کہیں سے بھی پھر پڑھیے آپ نیا ذائقہ محسوس کریں گے۔ خلیل مامون کی نظموں میں پُر اسراریت ایک نشان امتیاز ہے جو آپ کو گم نام بستیوں پُر اسرار قصوں اور نامعلوم حکایتوں تک بھی لے جا سکتا ہے۔ میں فن کی سریت کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ شاعر کے مزاج کی تہہ داری کی طرف اشارہ کر رہا ہوں اور اسی لیے نظم ایک صفحہ سے دس صفحوں تک کی ہو سکتی ہیں تو انہیں پڑھیں اور محسوس کریں کہ بھید بھری دنیا میں کیا کچھ ہے۔ یہ بڑا وصف ہے۔

تکنیکی طور پر بھی ان نظموں کو برتا گیا ہے اور دور دراز گو خوب کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ باطن کی بازیافت کا مسئلہ بھی زیر تخلیق آیا ہے۔ اسی پس منظر میں انہیں دیکھنا دیکھنا اور پڑھنا بھی چاہیے تا تخلیق کا جواز فراہم ہو۔

محبتیں اور شکایتیں

''آئندہ'' کے لیے اپنی اور ڈاکٹر عصمت دُرّانی کی چند غزلیں، نظمیں پیش خدمت ہیں اگر آپ کو مناسب لگیں تو ''آئندہ'' کسی اشاعت میں شامل فرمالیجیے گا۔ عین سلام
(24-A, Chaman, Housing Scheme, QUETTA Baluchistan)

''آئندہ'' کا تازہ شمارہ ۴۸ موصول ہوا اور ساتھ ہی آپ کا گلہ بھی کہ نہ مضمون بھیجا اور نہ کتاب۔ منتو پر آپ کی مطلوبہ کتاب پیشِ خدمت ہے۔ اگلے شمارے کے لیے مضمون بھی بھجوادوں گا۔ فتح محمد ملک
(Chairman, National Language Authrity Islamabad)

مرسلہ شمارہ ''آئندہ'' جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ موصول ہوا۔ آپ کی عنایت اور نوازش خاص کہ آپ یاد رکھتے ہیں، توجہ فرماتے ہیں اور رسالہ بھیجنے کی زحمت کرتے ہیں۔ انشاء اللہ استفادے کی صورتیں نکلیں گی۔ میں اپنی اور اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے آپ کا احسان مند ہوں۔ آپ ہمیں سلوک اور احسان یاد رکھنے والوں میں پائیں گے۔ کچھ وقت نکالیے اور ادھر کے نیاز مندوں کو بھی سیراب کیجیے۔ افتخار عارف
(Chairman, Academy of Letters Islamabad)

آپ کے بھجوائے ہوئے پرچے ڈاکٹر غلام حسین ساجد کی معرفت ملے۔ شکریہ آپ نے بہت محنت اور سلیقے سے ''آئندہ'' کے لیے مواد جمع کیا ہے خدا آپ کو اس خدمت میں ثابت قدم رہنے کی توفیق دے۔ دو تازہ منظومات بھجوا رہا ہوں کہ یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر۔ امجد اسلام امجد
(275-N, Defence Housing Athority, LAHORE)

پرچہ آج ہی ملا ہے۔ ارشاد کی تعمیل میں کتاب دوبارہ ارسال ہے۔ عرصہ سے کچھ نہیں لکھا۔

رشید امجد، راولپنڈی
(National University of Modern Languages, Islamabad)

حسب وعدہ نئی کہانی حاضر ہے۔ ادھر مصروفیت بڑھ جانے کی وجہ سے میں ذاتی طور پر حاضر نہ ہوسکا۔ تازہ شمارہ پڑھ چکا ہوں۔ اس دبلے پتلے پرچے میں آپ کافی مواد اکٹھا کر لیتے ہیں۔ طاہر نقوی
(Gulshan-e-Iqbal, Head Post Office, Box # Karachi-75300)

''آئندہ'' کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔ دو تازہ غزلیں ارسال کر رہا ہوں۔ قبول فرما کر مجھے شکر گزار ہونے کا موقع عنایت کیجیے گا۔ حسیر نوری
(B-III, Mustafa Abad, Malir City, Karachi, Pakistan-75050)

''آئندہ'' کا حالیہ شمارہ (۴۸) بابت اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء اپنے دامن میں کئی خوبصورت تحریریں لیے۔ ہے مگر بیدار بخت کا مضمون ''محمد علوی۔ ایک غیر متوقع شاعر'' خصوصی دلچسپی سے پڑھا، اس میں علوی کی بات، جچی نہیں لگی۔ مگر آدمی چاہے کتنا ہی ہشیار و بیدار ہو کچا گھڑا ہی رہے گا۔ وہ شاعر ہیں نرے شاعر، کھرے شاعر، بڑے سوہنے البیلے شاعر، انہیں ولی اللہ کا درجہ نہ دیجیے۔ وہ احمد آباد کے صوفی گھرانے میں ضرور پیدا ہوئے مگر وہ صوفی نہیں ہیں اور ایک بات کہ بیدار بخت نے علی الرغم علوی کی جس شعری تخلیق کو ان کی ایک اکیلی نعت قرار دیا ہے وہ نعت ہرگز نہیں۔
سیّد احمد رئیس
(3-D-28/45, Nazimabad Karachi)

''آئندہ'' پا کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے صفحۂ اوّل سے لے کر حرف آخر تک پڑھا۔ خوبصورت تحریروں سے سجا سجایا ایک جاذب نظر شمارہ ہے۔ میں اپنی کچھ چیزیں روانہ کر رہی ہوں۔ اگر پسند آجائیں تو انہیں بھی ''آئندہ'' میں جگہ دے دیں۔
صوفیہ انجم تاج
(1244, Millbrook Rd, Canton, MI-48188 U.S.A.)

مضمون بعنوان ''نثری نظم'' اور ایک انگریزی کہانی کا ترجمہ بعنوان ''دریافت'' ارسالِ خدمت ہے۔ ''مدفن'' ناول پر آپ کی رائے کا منتظر ہوں۔
نجم الدین احمد
(259-61/E, Block Z, Model Town, Bahawalnagar Panjab)

ایک نظم (تازہ) اور غزل، ایک مضمون حاضر ہے۔
سلیم شہزاد
23, Qasim Road, Bahawalnagar

کراچی سے واہ کینٹ ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ یہاں آکر دفتری اور گھریلو مصروفیات نے اُلجھائے رکھا مگر آپ کی پُرخلوص باتوں کی روشنی دل میں رہی۔ آج پھر سے رابطے کے لیے آپ کو دو عدد نظمیں ''آئندہ'' کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔ اسلام آباد تشریف لائیں تو ہمیں بھی کچھ وقت دیں۔
محمد مشتاق آثم
(10EV-79, Opp Markazi Jama Masjid Wah Cantt)

مدت سے رابطہ نہیں ہو رہا جس کی وجہ ایک میری ذاتی مصروفیات تھیں۔ اُمید ہے سابقہ دورِ تعطل کو چھوڑ کر ازسرِنو آپ ہم پر مہربانی فرما کر ''آئندہ'' کی کاپیاں ارسال فرمایا کریں۔
ایم ریاض بلوچ
(Albadar Book Centre, Goawadar Balochistan)

''آئندہ'' کے تازہ شمارے ۴۸ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷) میں زاہدہ حنا کے مضمون ''تخلیقی عمل: تجزیہ و تجربہ'' نے کچھ ایسا اپنے سحر میں رکھا کہ پڑھنے کے بعد اب تک کہ جب یہ خط لکھ رہا ہوں اس سے گویا آزاد نہیں ہوا۔ یہ مضمون ادب کے مزاج اور اس کے عمل دونوں کو سمجھنے کے لیے پورے اس کے دونوں پہلوؤں پر محیط کچھ اس قسم کا

ہے کہ اور اس سے زیادہ کیا بتایا جائے۔

زاہدہ دراصل قرۃ العین حیدر ہی کی قسم کی لکھنے والی ہیں اور جیسا کہ انہوں نے اس مضمون میں کی تعریف بھی کی ہے انہی کے زیر اثر معلوم ہوتی ہیں۔

زاہدہ حنا کے ہاں ویسا ہی بڑا منظر اور بہت سی چیزوں پر مشتمل ماحول ملتا ہے جس طرح کہ قرۃ العین حیدر کے ہاں "اگلے جنم مو ہے..........." میں ہے یا ان کے اپنے افسانے "جاگے ہیں خواب میں" ہے۔ جس کا تذکرہ ان کے اس مضمون میں آیا ہے ہر باب کے لحاظ سے گویا ایک چھوٹا سا ناول ہے اور پھر ایسے ہر ناول کی چیزیں اور کردار پیش ہوں۔

رب نواز مائل

(Kucha Qadir Shaheed, Faqir M Rd, QUETTA Baluchistan)

آپ کی خدمت میں چار نظمیں بھیج رہا ہوں اُمید ہے آپ کے معیار پر پوری اتریں گی۔ "یہ راہ ہماری" کا موضوع ذرا نازک سا ہے۔ اگر آپ میرے موقف کو درست نہیں سمجھتے ہوں یا اس کی اشاعت سے ناگواری کا خدشہ ہو تو بغیر کسی تامل کے اسے رد کر دیں۔ میری ذاتی رائے میں ہم لوگوں نے جس کوتاہ نظری کو راہ دے دیا ہے اور اس سے اختلاف کرنے سے گریز کرنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں اس لیے اس مکتبۂ خیال کو بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے کہ اکثریت ان کی ہم خیال ہے، مگر اس میں زیادہ نقصان کس کا ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا یہ ایک بڑا سوال ہے اور اس سے کیا کسی فائدے کی اُمید مستقبل بعید میں بھی ہے؟

وحید الحسن

(370 Oak Vista Lawrence Ville G.A. 30044 U.S.A.)

"آئندہ" کے نثر و شاعری دونوں کے حصے وقیع ہوتے ہیں۔ آپ کے اداریئے اپنے انوکھے پن، تیزی سے بہتے بیان اور دل کو چھو لینے والی زمینی حقیقتوں کی بناء پر "آئندہ" کی جان ہیں۔ اپنی چند تازہ کاوشیں حاضر ہیں۔

فہیم جاوید

(Senior Manager Sandi American Bank P.O.Box 833 Riyadh 11421)

ایک نظم حاضر خدمت ہے۔ چند ماہ پہلے امریکہ کے قیام کے دوران کہی تھی۔ اگر یہ نظم "آئندہ" کے لیے قابل اشاعت ہو تو کسی اگلے شمارہ میں شریک کر لیجیے۔ مظہر امام صاحب نے کہا تھا کہ "آئندہ" اُنہیں کئی کئی ماہ کی تاخیر سے مل پاتا ہے۔ آپ براہِ راست ان کو بھیج دیا کریں تو عنایت ہو گی۔ ڈاک کی شرح بھی مطبوعات کی تقسیم کو اتنا گراں کر دیتی ہے کہ ادبی رسالوں کے لیے ناقابلِ برداشت گراں باری کا سبب بن جاتی ہے۔ ہمارے ملک کی شرح پڑوسی ملک کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ ایسا کیوں۔؟ وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ کیا ہمارے یہاں علم و ادب کی ترسیل زیادہ ضروری نہیں ہے۔!

یوسف امام

(P.O.Box # 21025, Sharjah U.A.E.)

''آئندہ'' جلد۱۲شمارہ ۴۸ حاصل ہوا۔مبارک ہو کہ آپ کی ہمت واستقامت محنت وجستجو اور جبر واستقلال نے بارہ کامیاب سالوں کا سفر بخیر وخوبی انتہائی خوبصورتی سے معیاری ادب پیش کرتے ہوئے طے کیا اس دوران جن مشکلات اور مسائل کا سامنا اور مقابلہ آپ نے کیا ہے اسے قارئین ''آئندہ'' نہیں جانتے لیکن آپ کا دل جانتا ہے اب ہم جہاں تک آگئے ہیں اس کا گواہ ''آئندہ'' کا تازہ شمارہ ہے لیکن بقول آپ کے ہم اب بھی اس قلم کی تلاش میں ہیں جس کے بارے میں مشہور ہے ''قلم گوید کہ من شاہِ جہانم'' اور اس کی تائید میں محترمہ سائرہ غلام نبی کا اداریہ بھی تحرک کا باعث ہے کہ امریکہ جیسا ترقی یافتہ اور سپر پاور ملک ''ہماری شناخت ہمارے لٹریچر سے چاہتا ہے'' سو ہمیں لازم ہے کہ قلم کی حرمت وصداقت، عظمت ورفاقت کا علم بلند سے بلندتر کرنے کی اجتماعی جدوجہد کریں۔

شکر گزار ہوں کہ تازہ شمارے میں آپ نے میری حمد، نعت اور ایک مضمون ''اُردو میں قطعہ کی ہیئت'' کو شاملِ اشاعت فرمایا۔ پروف ریڈنگ یقیناً جوکھم کا کام ہے تمام تر احتیاطوں کے باوجود کچھ نہ کچھ رہ ہی جاتا ہے۔نعت کے تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں لفظ ''منزہ'' کو شہرہ کمپوز کیا گیا ہے۔لیکن مضمون میں صفحات کی ترتیب الٹی سیدھی ہوگئی ہے۔صفحہ ۵۳ کے بعد مرزا ذاکر حسین قزلباش، ثاقب لکھنوی کے قطعات صفحہ ۵۵ پر چلے گئے۔یوں وہ قطعات محترم احمد ندیم قاسمی کے قطعات سے منسلک ہوگئے اور مضمون بے ترتیبی کا شکار ہو کر فہم سے بالاتر ہوگیا۔مناسب سمجھیں تو ''آئندہ'' شمارے میں قارئین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول فرمائیں اور مطالعہ میں صفحات کی ترتیب یوں ہونا چاہیے صفحہ ۵۲، ۵۳ اور پھر صفحہ ۵۵ پھر صفحہ ۵۴ اور آخری صفحہ ۵۶ پڑھا جائے۔اگر ممکن ہو تو کسی شمارے میں اس مضمون کو درستگی کے ساتھ دوبارہ شائع فرمادیں لیکن میری یہ گزارشات آنے والے شمارے میں ضرور شاملِ اشاعت فرمائیں۔

یعقوب تصور

(Post Bux # 4628, ABUDHABI U.A.E.)

نوٹ : اپنی خواہش کے باوجود ہم ایک تحریر کی دوبارہ اشاعت کے لیے معذرت خواہ آپ کا خط حرف بہ حرف شائع کر رہے ہیں کہ ہماری معذرت قارئین اور مصنف کو کسی حد تک مطمئن کردے۔ذہن میں تصور ہے کہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ (ادارہ)

کافی عرصے کے بعد ''آئندہ'' کے دو شمارے (۴۷و۴۸) پروفیسر ڈاکٹر طارق چھتاری صاحب کے توسط سے موصول ہوئے۔ پہلے یہ رسالہ مکتبہ جامعہ (علی گڑھ) میں آیا کرتا تھا لیکن اب یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔ ''آئندہ'' سے زیادہ تر وہی لوگ بہرہ مند ہوتے ہوں گے جن کے پاس ذاتی طور سے یہ رسالہ آتا ہے۔

دونوں شماروں میں میرے مطلب کی کئی چیزیں شامل ہیں۔شمارہ نمبر ۴۷ میں پروفیسر ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کا مضمون ''نقد ادب اور زبان واسلوب کے مسائل'' پروفیسر اصغر عباس صاحب کا مضمون ''سرسیّد اور قدیم دہلی کالج'' اور ''لغت کبیر کی تدوین سے متعلق شازیہ عنبرین کا مضمون (جس میں میری کتاب کا حوالہ بھی ہے)

اہمیت سے خالی نہیں۔ منظومات والے حصے میں ڈاکٹر ارمان نجمی اور حسن عباس رضا کی غزلیں بڑی جاندار ہیں۔ اسی طرح نثر والا حصہ بھی اپنے مندرجات کے لحاظ سے خاصا متنوع ہے۔ ''محبتیں اور شکایتیں'' عنوان کے تحت قارئین کے خطوط کے صرف وہی حصے شائع کیے جائیں تو بہتر ہوگا، جن میں رسالے کے مندرجات پر رائے زنی کی گئی ہو۔ آپ نے اتنا عمدہ اور معیاری رسالہ تواتر اور تسلسل کے ساتھ جاری رکھا ہے، یہ بڑی قابلِ قدر بات ہے۔

شہاب الدین ثاقب
(Department of Urdu, Aligarh Muslim University)

''آئندہ'' کا حالیہ شمارہ مجھے دستیاب ہوا۔ عید کے روز میں نے بے حد کوشش کی کہ آپ سے رابطہ قائم ہو سکے اور میں عید کی مبارکباد آپ کو دے سکوں۔ ''آئندہ'' آپ صوری اور معنوی طور پر اتنا خوبصورت نکالتے ہیں کہ آپ پر رشک آتا ہے۔ اللہ آپ کو یونہی فعال رکھے۔

کرشن کمار طور
(134-E, Khanyara Qord, DHARAM SHALA : 176215, (H.P.) INDIA)

''آئندہ'' شمارہ نمبر ۴۸ زیرِ مطالعہ ہے۔ گذشتہ کی طرح اس کی حیثیت بھی دستاویزی ہے۔ اس کے معیار کو ایک خاص بلندی تک برقرار رکھنے میں آپ کامیاب ہیں۔ بغیر کسی گروپ یا تحریک کی حمایت حاصل کیے صرف قلمکاروں کے تعاون سے اس قدر معیاری رسالہ وقت کی پابندی کے ساتھ شائع کرنا آپ ہی کا کام ہے۔ تمام مضامین وقیع ہیں۔ زاہدہ حنا صاحبہ کا مضمون ''تخلیقی عمل: تجزیہ و تجربہ'' بہت اچھا ہے۔ شگفتہ تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔ بیدار بخت نے جدید شاعر محمد علوی کا تعارف اور مقام بڑے عالمانہ انداز میں متعین کیا ہے۔ شہلا نقوی کا افسانہ ''کسی کا بچہ'' اور شمیم منظر کا ''اس کے جانے سے'' مجھے بے حد پسند آئے۔ یہ دونوں افسانے انسانی اقدار کے مثبت پہلو کی طرف قاری کو مراجعت کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ حبیب حق کا افسانہ ''ماموں جان'' حامد سراج کا ''گرمی بہت ہے'' اور اقبال فریدی کا ''ریگ ساحل سے پُر غلیظ صدف'' معیاری افسانے ہیں۔

آپ کی منتخب کردہ نظمیں لاجواب ہیں۔ عصمت درانی، شاہین مفتی، حبیب حق، پروین شیر، شمی فاروقی اور پرویز مظفر وغیرہ کی نظمیں تہہ دار اور معنی خیز ہیں۔ ظفر اقبال، عصمت دُرّانی، انور سدید، صابر ظفر، حسن عباس رضا، قوس صدیقی، سلطان اختر، تنویر اختر اور رونق شہری کی غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ سازش کے تحت ہندوستان میں آزادی سے پہلے وہ علاقے جواب ہندی کے علاقے کہے جاتے ہیں وہاں صرف اُردو ہی رائج اور مقبول تھی۔ آپ کا اداریہ اور تبصرہ تخلیقی نوعیت کے ہیں۔ سائرہ غلام نبی کے تبصرے بے حد معیاری ہوتے ہیں۔ ''اور زبانوں کا ادب'' کے تحت ''روحوں کا سفر'' دلچسپ افسانہ ہے۔ گھر کے تمام افراد کو سلام و دعا۔ سائرہ غلام نبی کو سلام کہہ دیں۔

نجم عثمانی
(New Colony, Wasseypur, DHANBAD Jharkhand)

اک عرصے بعد آپ سے مخاطب ہوں۔ اُمید ہے میں آپ کے ذہن سے محو نہیں ہوئی ہوں گی۔ ''آنگن جب پردیس ہوا'' پڑھ کر آپ نے میری ہمت افزائی کی تھی۔ علی گڑھ جب آپ تشریف لائے تھے۔ پھر ملاقات ہوئی تھی۔ اب میں واپس ریاض آ گئی ہوں۔ ''آئندہ'' کبھی کبھار علی گڑھ میں مل جاتا تھا۔ افسانہ حاضر ہے۔

عذرا نقوی
(King Saud University P.O.Box 51178 Riyadh 11543 K.S.A)

آپ سے فون پر باتیں کر کے خوشی ہوتی ہے۔ اور آپ کی صحت اور دیگر اُمور کی براہِ راست آگاہی ہو جاتی ہے۔
پرکاش فکری کی موت کی خبر غیر متوقع تو نہیں تھی۔ وہ میرے اوائل عمر کے دوستوں میں تھے۔ اس لیے میرے لیے غم کی بات تھی۔ اس حلقے کے کلام حیدری اور انور عظیم کی موت تو میرے لیے غم انگیز تھی اب پرکاش فکری بھی چل بسے۔ انہیں ہم احباب ظہیر (ظہر الحسن) کے نام سے جانتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے شروع کے دور میں انہوں نے غزل کو روایتی نسبتوں استعاروں اور اسلوب بیان سے نکال کر عام زندگی سے الفاظ اور اظہار بیان سے خوبصورتی کے ساتھ مرصع کیا تھا۔ جسے بعد کی نسل نے اور جلد ہی غزل گوئی میں نئی روش پیدا کی جو مقبول ہوئی اور اس صنف کو اور وسعت دے گئی۔

یوسف امام
(P.O.Box 21025, Sharjah, U.A.E.)

''آئندہ'' کا شمارہ ۴۶ بھی جناب انیس امروہوی صاحب نے بھجوایا مشکور و ممنون ہوں اب یہ پرچہ انٹرنیشنل بن چکا ہے اس کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ایک دو افسانے پڑھے دو چار غزلیں بھی پڑھیں متاثر ہوا تو ایک غزل بھی کہہ لی۔

شمس فاروقی کا مضمون پڑھتے پڑھتے کئی باتیں یاد آئیں۔ ہندو سماج میں یہ چاروں (برہمن، چھتری، دیشیہ شودر) م آریہ سماج نے نہیں بنائے تھے۔ ایک رشی تلسی داس سے بھی پہلے ہوئے تھے۔ یہ ان ہی کا کام تھا۔ رشی منو کی ایک کتاب ''منوسمرتی'' ہے۔

''پشو شدر اور ناری انہیں ڈانٹتے پیٹتے رہو تو ٹھیک رہتے ہیں۔'' عورتوں اور جماداروں نے کئی بار احتجاج کیا۔ لیکن غریب کی کون سنتا ہے؟ یہاں سرکار کی طرف سے ایک اور حکم جاری ہوا تھا کہ جن زمینداروں کے پاس زمین زیادہ ہے اسے سرکار ضبط کرلے گی بس پھر کیا زمینداروں نے اپنی زمین مفت ونوبا بھاوے کو تقسیم کرنے کے لیے مکھیا بنائے گئے تھے رضا کارانہ دان دی اور انہوں نے دس دس ایکڑ زمین ہر کسان کو بلا کسی معاوضے کے دی۔ کاش! ایسا کوئی ونوبا بھاوے پاکستان میں بھی پیدا ہوتا! دوھے اور گیت بھی بھیج رہا ہوں۔
مظہر امام صاحب سلام گزار رہیں۔

بھگوان داس اعجاز
(T-1, Baljit Nagar, New Delhi-110008)

حال ہی میں بےنظیر بھٹو کے قتل کی صورتِ حال سے متاثر ہوکر چند اشعار لکھے تھے وہ ، سدہ ے۔ یہ ارسال کررہا ہوں۔

قیوم واثق
(Post Box 5648 JEDDAH - 21432 K.S.A.)

غزلیں اگر ''آئندہ'' کے منفرد معیار کے مطابق ہوں تو شائع کرنے کی زحمت گوارا کریں۔

عقیل گیاوی
(Iqra Academy Wasseypur, Dhanbad 826001 Jharkhand INDIA)

''آئندہ'' سے اور آپ سے رابطہ نہ ہونے کا سبب کچھ یوں تھا کہ میں یہاں تھا نہیں۔ چند روز پہلے جو ''آئندہ'' کا شمارہ مجھے ملا ہے حسبِ معمول خیال افروز، بامعنی اور خوبصورت ہے۔ بس اس شمارے میں ستیہ پال آنند کا خط پڑھ کر اُداسی نے گھیر لیا، انہوں نے اپنی طویل بیماری کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ میں اس تحریر کو پڑھ کر ابھی تک سنبھل نہیں سکا۔ ستیہ پال آنند انتہائی، حساس اور ذہین شاعر ہیں، ابھی جدید نظم کو ان کی بڑی ضرورت ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔

''آئندہ'' سے غیر حاضر رہنا اچھا نہیں لگتا۔ بس ہم آپ اور ستیہ پال آنند جیسے لوگوں کو بھی اس وبال میں سر کھپانا پڑتا ہے۔ اس عالم میں مجید امجد کی نظم ''آٹو گراف'' یاد آتی ہے۔

نئی غزلیں ''آئندہ'' کے لیے ارسال ہیں اُمید ہے پسند آئیں گی۔

نذیر قیصر
Adress:

''آئندہ'' گذشتہ چند شمارے سے برابر مل رہا ہے، برادرم ارمان نجمی (پٹنہ) کے توسط سے یہ ان کی بھی نگاہِ توجہ ہے اور آپ کی عنایت ہے کہ بمبئی کے ہم چند شناسانِ ادب کو ''آئندہ'' سے نواز رہے ہیں۔ اس سے پہلے کبھی کبھار کسی بک اسٹال سے یا کسی دوست کے پاس دستیاب ہوجاتا تھا، یا کبھی قبلہ ضمیر نیازی مرحوم ارسال کروا دیا کرتے تھے۔ مگر اکثر و بیشتر تشنگی ہی رہتی تھی۔

''آئندہ'' ہمارے لیے چند عزیز ترین نمائندہ ادبی رسائل میں سے ایک ہے۔

عبدالاحد ساز
(84 Chakla Street, Mumbai : 400003)

❁❁

Golden Sun
اب سب فٹ ہے
Golden Sun
Pure and Healthy
سپر ریفائنڈ کنولا بلینڈ آئل
IFFCO
Touching lives a hundred different ways